کثرتِ عبادت

عزیمت یا بدعت؟

ترتیب: **اعجاز احمد اعظمی**

مدرسہ شیخ الاسلام شیخوپور اعظم گڈھ

جملہ حقوق محفوظ ہیں

نام کتاب : کثرت عبادت عزیمت یا بدعت؟
ترتیب : اعجاز احمد اعظمی مدرسہ شیخ الاسلام شیخوپور اعظم گڑھ
باہتمام : الحاج محمد ناصر خاں
پرنٹرس : فرید انٹر پرائزز دہلی
ناشر : فرید بک ڈپو پرائیویٹ لمیٹڈ
کمپوزنگ : شبیر احمد (ریلائنس کمپیوٹر، فون: 3277133)
قیمت : 28/=
صفحات : 146
سرورق : کفیل احمد
سائز : 20×30/16

بسم اللہ الرحمن الرحیم

تمہید

یہ کتابچہ جو آپ کے ہاتھوں میں ہے، لکھنے والے کی تصنیف نہیں ہے، بلکہ برصغیر ہندو پاک کے مشہور محدث فقیہ حضرت مولانا عبدالحی صاحب فرنگی محلی نور اللہ مرقدہٗ کے ایک عربی رسالہ "اقامة الحجة على ان الاكثار في التعبد ليس ببدعة" کی ترجمانی و تلخیص ہے بعض مدعیان حدیث اور مخالفان زہد و تصوف کی جانب سے یہ آواز باربار آتی رہتی ہے کہ عبادت و ریاضت کی کثرت، اور زہد و تقوٰی کا بہت زیادہ اہتمام نہ صرف یہ کہ ناپسندیدۂ شریعت ہے، بلکہ بدعت ہے۔ یہ آواز اتنی تکلیف دہ ہے کہ جب کبھی یہ آواز سنائی دی ہے، ایمانی غیرت کو جنبش ہوئی ہے۔ بار بار خیال ہوا کہ اس موضوع پر مطالعہ کرنا اور حاصل مطالعہ لکھنا چاہیئے، مالیگاؤں میں ایک مرتبہ ایک جلسہ میں تقریر کرنے کی نوبت آئی، اس میں اکابر سلف کی عبادت و ریاضت کا ذکر آیا، تو ایک نوجوان صبح کو مجھ سے جھگڑنے آگیا، اس کو میں نے نرمی سے سمجھایا۔ مگر وہ مجھے سمجھانے آیا تھا، سمجھنے کے لئے نہیں آیا تھا، واپسی پر اس کا خط آیا۔ یہی جدال اور یہی خط دونوں محرک بنے، اور میں نے مطالعہ اور غور وفکر شروع کیا۔ اتفاق بلکہ حسن اتفاق دیکھئے نہیں بلکہ تائید الٰہی اور نصرت غیبی! انھیں دنوں میرے عزیز مولانا حافظ سفیان احمد صاحب سلمہٗ استاذ مدرسہ شیخ الاسلام شیخوپور نے تذکرہ کیا کہ حضرت مولانا عبدالحی صاحب فرنگی محلی کے رسالہ اقامة الحجة کو مشہور محقق عالم شیخ عبدالفتاح ابوغدہ نے تحقیقات و تعلیقات سے مزین کرکے بہت عمدہ کتابت و طباعت کے ساتھ شائع کیا ہے اور یہ کہ وہ رسالہ ان کے پاس ہے۔ مجھے اس کے مطالعہ اور اس سے استفادے کا اشتیاق ہوا۔ انھوں نے ازراہ کرم وہ کتاب مجھے ہدیہ

کردی۔ اس کا مطالعہ کیا، تو آنکھیں ٹھنڈی ہوئیں، اور دل میں علم کی روشنی پھیلتی چلی گئی۔ یہ رسالہ روایت و درایت کا ایک بہترین مجموعہ ہے۔

میں نے محسوس کیا کہ اس کتاب کی تلخیص کر دینا ہی بہت کافی ہے، چنانچہ ترجمہ کرنے کے بجائے، میں نے اس کے مضامین کو اپنے الفاظ میں لکھنا شروع کر دیا، لکھتا گیا۔ اور اس کی ایک ایک قسط ماہنامہ انوار العلوم جہانا گنج میں چھپتی رہی۔ غالباً بارہ قسطوں میں یہ مضمون مکمل ہوا۔ میں نے اپنے مضمون میں اقامۃ الحجۃ کے مضامین کو تو لیا ہی ہے، اس کے حواشی و تعلیقات جو شیخ عبد الفتاح ابو غدہ نے تحریر فرمائے ہیں سے بھی استفادہ کیا، کہیں کہیں واقعات کا اضافہ بھی کیا ہے، اس طرح یہ کتابچہ اپنے مضامین و مآخذ کے اعتبار سے تو اقامۃ الحجۃ اور اس کے تعلیقات و حواشی کا مرہونِ منت ہے۔ مگر ترتیب و تالیف کے لحاظ سے ایک بہت ناقص اور کمزور بندے کی طرف منسوب ہے۔ اس میں اگر غلطی ہے، تو اس کا ذمہ دار میں ہوں، مولانا عبد الحی صاحب شیخ ابو غدہ اس سے بری ہیں۔ اور اگر کوئی خوبی ہے، تو یہ خوبی مذکورہ بالا دونوں بزرگوں کے نام کی برکت ہے۔ اس کا نام "کیا کثرت عبادت بدعت ہے؟" مصلح الدین حضرت مولانا شاہ وصی اللہ نور اللہ مرقدہٗ کے ایک مضمون سے ماخوذ ہے۔ چنانچہ کتاب کے اندر یہی عنوان ہے۔

اب جبکہ میرے عزیز مولانا حافظ ضیاء الحق صاحب سلمہٗ مدیر ضیاء الاسلام شیخوپور کی تحریک سے فرید بکڈپو سے کتابی شکل میں مضمون شائع ہو رہا ہے، تو اس کا نام "کثرت عبادت عزیمت یا بدعت؟ رکھا ہے۔ میں فرید بکڈپو کے مالک جناب الحاج محمد ناصر صاحب کا بہت شکر گزار ہوں کہ انھوں نے اس کی اشاعت کی ذمہ داری لی۔ اور اسے شائع کر رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کے اس حسن عمل کو قبول فرمائیں، اور دارین میں بہترین اجر سے نوازیں۔ آمین

اعجاز احمد اعظمی
۲۰ رجب ۱۴۲۳ھ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

کیا عبادت کی کثرت بدعت ہے؟

قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ: وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ ۝ (سورۂ ذاریات آیت ۵۶) میں نے جن اور انسان کو صرف اس لئے پیدا کیا ہے کہ وہ میری عبادت کریں۔ اس آیت میں کسی تاویل وتوجیہ کی گنجائش نہیں ہے۔ یہ صاف بتارہی ہے کہ انسان ہوں یا جنّات ان کی خلقت کا مقصد ہی یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی بندگی کریں، اور اپنے غلام ہونے کا اقرار کرتے رہیں، خواہ خوشی سے، خواہ مجبوراً۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ اس کی تفسیر میں فرماتے ہیں: اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ اَیْ اِلَّا لِيُقِرُّوْا بِعِبَادَتِیْ طَوْعًا اَوْكَرْهًا۔ [1]

اس آیت کی تفسیر کے ذیل میں حافظ ابن کثیر نے اپنی تفسیر میں مسند احمد، ترمذی اور ابن ماجہ کے حوالہ سے ایک حدیث نقل کی ہے، یہ روایت حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے

---

[1] تفسیر ابن کثیر ص ۳۶۷ ج ۴

ارشاد فرمایا: قَالَ اللّٰهُ تَعَالیٰ یَا ابْنَ اٰدَمَ تَفَرَّغْ لِعِبَادَتِیْ اَمْلَأُ صَدْرَکَ غِنًی وَّاَسُدُّ فَقْرَکَ وَاِلَّا تَفْعَلْ مَلَأْتُ صَدْرَکَ شُغْلًا وَّلَمْ اَسُدَّ فَقْرَکَ۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ اے آدم کے بیٹے! میری عبادت کے لئے فارغ ہو جا، میں تیرے سینے کو غنا (مالداری کی بے فکری) سے بھر دوں گا اور تمہاری محتاجی کو دور کر دوں گا اور اگر تم ایسا نہ کرو گے، تو تمہارے سینے کو مشغولیت سے بھر دوں گا، اور تمہاری محتاجی اور فقر کو دور نہیں کروں گا۔

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ عبادت کے لئے یکسو ہو جانا۔ اور اس کے لئے اپنے اوقات کو فارغ کر لینا، اللہ تعالیٰ کے نزدیک مطلوب بھی ہے، اور محبوب بھی ہے، اسی لئے اس پر حق تعالیٰ نے جس بات کا وعدہ فرمایا ہے، عموماً لوگوں کے نزدیک وہی سب سے زیادہ اہم چیز ہے یعنی دل کی بے فکری، محتاجی کا ڈر نہ ہونا، تنگدستی کا دور ہونا۔ سب انسانوں کی بھاگ دوڑ اسی کے لئے ہوتی ہے، اور اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ یہ دولت، عبادت کے لئے یکسو ہونے سے حاصل ہوتی ہے۔

اللہ تعالیٰ نے ایک اور جگہ ارشاد فرمایا ہے کہ: کَانُوْا قَلِیْلًا مِّنَ الَّیْلِ مَا یَهْجَعُوْنَ O وَ بِالْاَسْحَارِهُمْ یَسْتَغْفِرُوْنَ O (ذاریات ۱۷۔۱۸) رات میں یہ لوگ کم سوتے ہیں، اور صبح کے وقت اللہ تعالیٰ سے مغفرت کا سوال کرتے ہیں۔ امام زہری اور حسن بصری علیہما الرحمۃ سے منقول ہے کہ کم سونے کا مطلب یہ ہے کہ رات کے زیادہ تر حصے میں نماز پڑھتے ہیں، اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ وہ لوگ

رات کو نہیں سوتے۔ [۱]

حق تعالیٰ نے ایمان والوں کی ایک صفت یہ بیان کی ہے، کہ: تَتَجَافٰی جُنُوْبُهُمْ عَنِ الْمَضَاجِعِ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ خَوْفًا وَّطَمَعًا ز (سورۂ سجدہ ۱۶) ان کے پہلو خواب گاہوں سے جدا رہتے ہیں، اور وہ اپنے رب کو خوف اور امید کے ساتھ پکارتے ہیں۔ اس آیت میں بھی رات میں جاگ کر نماز و عبادت میں مشغولیت کا ذکر ہے۔

ظاہر ہے کہ ان آیات میں فرض نمازوں کا ذکر نہیں ہے، کیونکہ فرائض کے اوقات ایسے ہیں کہ اس وقت تک آدمی عادۃً جاگتا ہے، اس جاگنے کی اتنی اہمیت کیا ہو سکتی ہے؟ تاہم حضرات مفسرین نے ظاہر الفاظ سے فائدہ اٹھاتے ہوئے عشاء تک جاگنے کو بھی اس میں شامل کیا ہے، یعنی جو شخص عشاء کی نماز کا انتظار کرے، اور اسے ادا کر کے سوئے، وہ بھی اس فضیلت کا مستحق ہوگا، بلاشبہ یہ بھی رات کے جاگنے میں داخل ہے۔ لیکن اس کا اصل مصداق یہ ہے کہ آدمی رات میں زیادہ تر جاگ کر اللہ کی عبادت میں مشغول رہے، چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی راتیں اگر احادیث و سیر کی کتابوں میں تلاش کی جائیں، تو آپ زیادہ تر جاگتے ہوئے ملیں گے، عشاء کے بعد بھی آپ دیر تک ذکر و تسبیح میں مشغول رہتے اور بہت سویرے آدھی رات کے بعد عموماً اُٹھ جاتے، اور طول قرأت کے ساتھ اور لمبے رکوع و سجود کے ساتھ نماز ادا کرتے یہ بات آپ کی سیرت میں اتنی عام اور مشہور ہے کہ اس کے لئے کسی شاہد و

---

[۱] ایضاً ص ۳۶۱ ج ۴

برہان کی ضرورت نہیں۔

پھر یوں بھی سوچنے سے یہ بات بخوبی سمجھ میں آسکتی ہے کہ آدمی کی خلقت ہی جب عبادت کے لئے ہوئی ہے، تو مقصد میں جتنا اپنا وقت وہ صرف کرے گا، اور اس کے لئے جتنا وہ اپنے آپ کو کھپائے گا مفید ہی مفید ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت جہاں سے جی چاہے دیکھ لیجئے، ہر جگہ عبادت، نماز، روزہ، صدقہ وخیرات اور ذکر وتلاوت کا رنگ نمایاں نظر آئے گا۔ یہ بات تو شریعت اور دین کے بدیہیات میں ہے، جس میں کسی ادنیٰ واقف کار کو بھی شبہ نہیں ہوسکتا۔

لیکن اب جہل کی کچھ ایسی ہوا چلی ہے، کہ دین وشریعت کے مسلمات کو بھی تختۂ مشق بنایا جاتا ہے، لوگ دنیا داری میں منہمک ہوکر عبادت سے غافل ہوگئے ہیں۔ تو چاہتے ہیں کہ اپنی غفلت اور کاہلی کی سند قرآن وحدیث سے لائیں، کاش ایسا ہوتا کہ غافلوں اور عبادت میں کوتاہی کرنے والوں کا یہ ٹولہ اپنی کوتاہیٔ عمل اور نارسائی عبادت پر نادم ہوتا، شرمندہ ہوتا، خود کو قصوروار گردانتا، اور رب کے حضور استغفار کرتا، اگر ایسا کرتا، تو بہت اچھا ہوتا، خود اس ٹولہ کے حق میں اور دوسرے مسلمانوں کے حق میں بھی۔

مگر ان ستم ظریفوں نے یہ نہیں کیا، اور کیا تو یہ کیا کہ اپنی بے عملی وسستی کے جواز میں سندیں قرآن وحدیث سے لانے لگے۔ اور اس کے نتیجے میں کثرتِ عبادت کو بدعت کہنے لگے اور جن اکابر نے، بکثرت عبادت کی ہے، اور ان کی عبادت کے تذکروں سے کتابیں معمور ہیں۔ یا تو ان کو مرتکب بدعت

قرار دیا، یا ان کی طرف منسوب واقعات کو جھٹلایا یہ راہ سخت خطرناک ہے، اس پر چلنے کی وجہ سے دین کے ان نئے ترجمانوں نے اسلاف کی تمام خدمات وعبادات اور ان کے ریاضات ومجاہدات پر صرف پانی نہیں پھیرا ہے، بلکہ ان کو مجرموں کی صف میں کھڑا کر دیا ہے۔ فَاِلَی اللّٰہِ الْمُشْتَکٰی۔

یہ ستم ڈھانے والے ہمارے زمانے میں زیادہ تر وہ ہیں، جو تقلید سے بے زاری کا دعویٰ کر کے منصب اجتہاد پر غاصبانہ قبضہ کرنا چاہتے ہیں۔ یا انہیں کے پس رو جماعت اسلامی کے افراد ہیں۔ اور ان لوگوں کی شورا شوری سے متاثر ہو کر بعض وہ لوگ بھی ہاں میں ہاں ملانے لگے ہیں، جن کا تعلق اہل حق کی جماعت سے ہے۔

اس سلسلے میں حضرت مولانا عبدالحئ محدث فرنگی محلی کا بیان بہت بصیرت افروز ہے ہم اس کی تلخیص یہاں پیش کرتے ہیں۔ مولانا لکھتے ہیں:

> ”مجھے ابتداء عمر سے اسماء الرجال کی کتابوں کے مطالعہ کا بے حد شوق تھا، میں ارباب کمال کے احوال کو پڑھتا رہتا تھا۔ میں چاہتا تھا کہ ان بزرگوں کی صفات واخلاق کا کچھ اثر میرے اندر بھی آئے، اور میں بھی انہیں کی راہ چلوں، میں نے دوران مطالعہ یہ بات خوب پائی کہ ہمارے اسلاف بکثرت مجاہدات کرتے تھے وہ ہمہ وقت عبادت کی محنت وکاوش میں منہمک رہتے، پھر بعد کے لوگوں کو بھی دیکھا کہ وہ بھی جنت کی طلب میں بکثرت عبادت و ریاضت کیا کرتے، اور میں یہی سمجھتا رہا کہ صراط مستقیم یہی ہے،

اور اسی سے جنت کے درجات حاصل ہو سکتے ہیں‘‘ [۱]

مولانا فرماتے ہیں کہ بعد میں جب میں نے کتب حدیث کا مطالعہ کیا تو بعض ایسی حدیثیں اور روایتیں نظر سے گزریں، جن میں کثرت عبادت سے ممانعت معلوم ہوتی ہے اور زیادہ زہد اختیار کرنے کی کراہت کا پتہ چلتا ہے۔

مجھے اس کے بعد اشکال ہوا کہ ایک طرف اکابر کے یہ سخت مجاہدات وریاضات ہیں، اور دوسری طرف یہ حدیثیں ہیں، دونوں میں تطبیق کس طرح ہوگی؟ پھر مولانا کو اس کا حل مل گیا۔ اس اشکال کے پیش آنے کے بعد انہوں نے وہ راستہ نہیں اختیار کیا، جو آج کل کے گدرانے سے پہلے پک جانے والے مجتہدین و محققین نے اختیار کیا ہے کہ آنکھ بند کر کے، صُمًّا وَّعُمْيَانًا [۲] حدیث کے ظاہر الفاظ کو پکڑ کر بیٹھ گئے اور عبادت وریاضت کی مشقت برداشت کرنے والے اکابر امت کو بدعتی قرار دے کر انہیں مجرموں کے کٹہرے میں کھڑا کر دیا، مولانا نے اہل تحقیق کا راستہ اختیار کیا، انہوں نے اس سلسلے کی تمام روایتوں کی چھان بین کی، اور عبادت کی ترغیب جن احادیث و آیات میں آئی ہے۔ انہیں بھی پیش نظر رکھا، اس سلسلے میں فقہاء و محدثین نے جو کچھ فرمایا ہے، اس کا بھی مطالعہ کیا، حضرات شارحین نے جو کچھ لکھا ہے اسے

---

[۱] اقامة الحجة على ان الاكثار فى التعبد ليس ببدعة بتحقيق عبد الفتاح ابى غده ص ۱۰

[۲] اشارہ قرآن کی اس آیت کی طرف۔ وَالَّذِيْنَ اِذَا ذُكِّرُوْا بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ لَمْ يَخِرُّوْا عَلَيْهَا صُمًّا وَّعُمْيَانًا (سورۃ الفرقان) اللہ کے خاص بندوں کی ایک صفت یہ بھی ہے کہ ان کو جب ان کے رب کی آیات سے نصیحت کی جاتی ہے۔ تو ان پر اندھے بہرے بن کر نہیں گرتے (بلکہ سمجھ بوجھ سے کام لیتے ہیں۔)

بھی سامنے رکھا۔ پھر ایک فیصلہ فرمایا چنانچہ فرماتے ہیں۔

فظھرلی ان الاخبار فی ذلک مختلفة بعضھا یھدی الی الاجتھاد وبعضھا یرشد الی الاقتصاد وکلھا واردة فی محلھا، واقعة فی موقعھا۔ فاخبار الاجتھاد محمولة علی من قدر ذلک، واخبار الاقتصاد محمولة علی من عجز عن ذلک۔

میرے سامنے یہ بات آئی ہے کہ احادیث و آثار اس باب میں مختلف نوع کے ہیں، بعض سے یہ پتہ چلتا ہے کہ عبادت میں خوب محنت کرنی چاہیئے، اور بعض کا اشارہ یہ ہے کہ میانہ روی اختیار کی جائے، اور حقیقت یہ ہے کہ یہ سب اپنے اپنے محل اور موقع کے لحاظ سے ہیں۔ محنت وکوشش اور کثرت عبادت ان کے حق میں ہے، جو اس پر قدرت رکھتے ہوں، اور میانہ روی کی حدیثیں ان کے حق میں ہیں، جو اس سے عاجز ہوں۔

پھر لکھتے ہیں کہ:

وعلی ھذا وجدت کلمات العلماء الاعلام الائمة الکرام۔

یہی فیصلہ اکابر علماء اور ائمۂ کرام کے اقوال وکلمات میں ملا۔

یہ فیصلہ کتنا صاف ستھرا ہے، اس سے معلوم ہوا کہ اگر کسی کو قدرت ہو، تو اس کے حق میں اصل یہی ہے کہ وہ زیادہ سے زیادہ عبادت کرے، اور اپنے آپ کو اللہ کے سامنے تھکائے۔ فَاِذَا فَرَغْتَ فَانْصَبْ وَاِلٰی رَبِّکَ فَارْغَبْ۔ جب تم دوسرے کاموں سے فارغ ہوجاؤ تو مشقت اٹھاؤ، اور اپنے رب کے

حضور رغبت سے حاضر ہو۔

اور جن کو اس کی قدرت نہ ہو، طبیعت کے وہ ضعیف ہوں، یا جسم کے وہ کمزور ہوں یا کثرت عبادت سے ان کے اکتا جانے کا اندیشہ ہو، یا اس کی وجہ سے حقوق واجبہ کی ادائیگی میں کوتاہی ہونے لگے، تو ان کے لئے ممانعت ہے، گویا دوسرے لفظوں میں ان کے لئے رخصت ہے کہ تھوڑی عبادت پر اکتفا کریں۔ اگر بنظرِ تحقیق دیکھا جائے، تو میانہ روی کو ثابت کرنے والی حدیثیں رخصت وسہولت دیتی ہیں، ورنہ عزیمت یہی ہے کہ عبادات کی خوب کثرت کی جائے۔

مولانا عبدالحئ صاحب فرنگی محلی اپنے اس فیصلے پر مطمئن ہوگئے۔ کیونکہ انہیں تمام اکابر علماء کی تائید حاصل ہوگئی، لیکن سننے کی بات یہ ہے کہ اسی دوران فرماتے ہیں کہ مجھ سے ایک شخص نے کہا کہ:

> ”عبادت میں محنت ومجاہدہ کرنا، مثلاً پوری رات عبادت میں مشغول رہنا، ایک رکعت میں پورا قرآن پڑھ لینا، ایک ہزار رکعت نفل پڑھنا جو اکابر ائمہ سے منقول ہے۔ یہ سب بدعت ہے، اور ہر بدعت گمراہی ہے۔“

مولانا پر اس بات کا کیا اثر ہوا، وہ تو حیرت زدہ ہوگئے، انہوں نے فرمایا کہ تو کیا یہ سارے صحابہ وتابعین اور محدثین کا گروہ جو بڑے بڑے مجاہدات کیا کرتا تھا، یہ سب اہل بدعت ہیں؟ اس پر اس نے جواب دیا کہ اس سے ممانعت کی حدیثیں موجود ہیں اور صحیح احادیث مروی ہیں۔

مولانا نے جواب دیا کہ یہ بات وہی کہہ سکتا ہے، جس کی نظر میں وسعت نہیں ہے، جو صرف الفاظ کے ظاہر پر نظر جماتا ہے کیا تمہیں معلوم نہیں کہ بدعت وہ کام ہے جو عہد نبوی، عہد صحابہ اور عہد تابعین، تین زمانوں میں نہ پایا گیا ہو، اور نہ اس کے لئے قرآن وسنت اور اجماع وقیاس میں کوئی دلیل ہو اور عبادات ومجاہدات کی کثرت تو ان مبارک ایام میں خوب ملتی ہے اور نصوص سے تو اس کا جواز بلکہ استحباب معلوم ہوتا ہے، بشرطیکہ آدمی کو قدرت وطاقت ہو۔

اس پر وہ عاجز ہوکر کہنے لگا، کہ ہمارے زمانے کے بعض علماء نے اس کے بدعت ہونے کی تصریح کی ہے اور ان کا قول اہل تحقیق کے نزدیک مقبول ہے، مولانا نے جواب دیا کہ اگر واقعی ایسا ہے، تو ان کو ممانعت کی حدیثوں کی وجہ سے اشتباہ ہوا ہے، اور انہوں نے تمام اصول شرع کو پیش نظر نہیں رکھا۔ اس سلسلے میں وہ معذور ہیں، بلکہ مستحق اجر ہیں۔ لیکن اکابر قدماء محدثین وفقہاء نے اس کو جائز قرار دیا ہے پھر ان کا قول کیوں معتبر نہیں ہے۔

شخص مذکور اس کا کوئی جواب نہ دے سکا، اور چپ چاپ تصویر حیرت بن کر رہ گیا۔

اتنی تفصیل یہاں اس لئے نقل کی گئی کہ بنیادی غلطی واضح ہو جائے، اس کے بعد بھی اگر کوئی شخص، کثرت عبادت کو بدعت کہے جائے، تو یہ محض دھاندلی اور ہٹ دھرمی ہے۔

پچھلے سال ایک علمی جگہ جلسہ میں حاضری ہوئی تھی۔ اس میں دوران وعظ امام ابوحنیفہ علیہ الرحمۃ کی کثرت عبادت اور مجاہدہ کا ذکر آگیا، تو وہ مشہور بات

بھی زبان پر آئی، جو اُن کے تذکرے کی قدیم وجدید ہر کتاب میں موجود ہے کہ انہوں نے چالیس سال تک عشاء کے وضو سے فجر کی نماز ادا کی ہے، پھر اس پر اشکال واستبعاد کا ذکر کر کے اس کا جواب بھی پیش کیا تھا۔ لیکن دوسرے دن ایک نوجوان جو شکل وصورت سے اسلام کا انگریزی ایڈیشن نظر آرہا تھا۔ آیا۔ اور اس مسئلے پر مجھ سے الجھنے لگا۔ میں نے اسے بتایا کہ رات کے وعظ میں اس کو میں مفصل سمجھا چکا ہوں۔ وہ اسے بار بار بدعت کہتا رہا۔ اور دعویٰ یہ کر رہا تھا کہ امام ابوحنیفہؒ کے بارے میں یہ واقعہ صحیح نہیں ہے کسی نے گھڑ کر ان کی طرف منسوب کر دیا ہے، میں نے اسے بتایا کہ امام صاحب کے تذکرہ وسوانح کی ہر کتاب میں یہ بات موجود ہے، وہ کہہ رہا تھا کہ اس کا مستند حوالہ چاہیئے، پھر یہ کہہ کر اٹھ گیا کہ میں خط وکتابت کروں گا۔

میں مدرسہ واپس آیا تو اس کا خط آیا۔ میں نے کتابوں کے حوالے لکھ کر بھیج دیئے۔ اس پر اس کا جو جواب آیا، وہ ہمارے موضوع سے متعلق ہے۔ اس لئے مناسب ہے کہ اس کے ضروری اجزا یہاں نقل کر کے اس کا جواب بھی نقل کر دوں۔ اس نے لکھا:

> آپ نے امام ابوحنیفہؒ کے تعلق سے حوالے نقل کئے ہیں، مگر نص قطعی اور صحیح احادیث سے اعراض کیا۔ قرآن کی آیت قُمِ الَّیْلَ اِلَّا قَلِیْلًا ۝ (رات میں نماز پڑھو مگر تھوڑی دیر) اَنَّكَ تَقُوْمُ اَدْنٰی مِنْ ثُلُثَيِ الَّیْلِ وَنِصْفَهٗ وَثُلُثَهٗ (تم دو تہائی رات کے قریب، اور نصف رات اور ایک تہائی رات تک نماز پڑھتے ہو) فَاقْرَءُوْا

مَا تَيَسَّرَ مِنَ الْقُرْاٰنِ ؕ (جتنا قرآن میسر ہو پڑھو) كَانُوْا قَلِيْلًا مِّنَ الَّيْلِ مَا يَهْجَعُوْنَ ۝ (رات میں کم سوتے ہیں) ان تمام آیتوں کے بارے میں آپ کیا کہیں گے اگر امام ابو حنیفہؒ کا واقعہ صحیح مان لیا جائے۔

ثلاث رہط والی حدیث جو مشکوٰۃ میں ہے، تین صحابیوں کا تذکرہ کہ انہوں نے تقالوها ما يفعل رسول الله من العبادة (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عبادت کو کم سمجھا تھا) فقالوا نحن نفعل كذا كذا فذكر اقوالهم وقال انا اتقاكم واخشاكم عند اللّٰه ولكن انام وارقد و اتزوج النساء (انہوں نے کہا کہ ہم ایسا ایسا کریں گے، آپ نے ان کی باتوں کا تذکرہ کر کے فرمایا میں اللہ سے تمہارے مقابلے میں زیادہ ڈرنے والا ہوں۔ لیکن میں سوتا بھی ہوں اور عورتوں سے نکاح بھی کرتا ہوں) اوكما قال عليه السلام وايضا قال عليه السلام الا من رغب عن سنتی فليس منی (نیز آپ نے فرمایا کہ جو میرے طریقے سے منحرف ہوگا، اس کا مجھ سے تعلق نہیں، فلما ذا لاتتفكر على هذا الحديث عليك ان تطالع المتن من المرجع (آپ اس حدیث پر کیوں نہیں غور کرتے، آپ کو چاہیے کہ اصل کتاب میں متن حدیث کا مطالعہ کریں)۔

وايضا حديث صحيح انكر سلمان الفارسی علی عبادة ابی ذر

وقال لعينك عليك حق وَلجسدك عليك حق وايده رسول اللّٰہ یعنی سلمان (نیز صحیح حدیث ہے کہ حضرت سلمان فارسی نے حضرت ابوذر کی عبادت پر نکیر کی اور فرمایا کہ تمہاری آنکھ کا تم پر حق ہے، تمہارے جسم کا تم پر حق ہے اور آپ نے حضرت سلمان کی تائید فرمائی۔)

والمراجع التی نقلت ان شاء اللّٰہ ساطالعه ولكن عليك ان تفكر على مانقلت الآن۔ (جن کتابوں کا آپ نے حوالہ دیا ہے، میں انشاء اللہ انہیں دیکھ لوں گا، لیکن آپ پر لازم ہے کہ میں نے جو کچھ ابھی نقل کیا ہے اس پر غور کریں) [1]

خاکسار نے اس کا اجمالاً جواب لکھا تھا۔ اسے بھی ملاحظہ فرمالیں، جواب کی اجمالی باتوں کی تشریح انشاء اللہ مضمون میں مناسب مواقع پر آتی رہے گی۔

”میں آپ کا خط پڑھ کر شش و پنج میں پڑ گیا کہ جواب لکھوں یا خاموشی اختیار کروں، بات یہ ہے کہ جب علم بھی نہ ہو، عقل بھی قدر ضرورت سے کم ہو، اور پھر آدمی نے طے کرلیا ہو کہ سمجھنا نہیں ہے، تو تخاطب کا کوئی فائدہ نہیں ہوتا، آپ نے قرآن کی چند آیتیں اور ایک دو حدیثیں پڑھیں، اور اس کی بنیاد پر اساطین امت کی زندگیوں میں عیب جوئی کرنے بیٹھ گئے ایسی صورت میں بجز خاموشی کے اور کیا چارہ ہے، تاہم چند سطریں رفع انتظار کے لئے لکھ دینا چاہتا ہوں۔

---

[1] اس خط سے اندازہ ہوا کہ موصوف مولوی ہیں۔ لیکن ان کی صورت اس کا پتہ دینے میں ناکام تھی، عربی کی غلط صحیح عبارتیں انہیں کی ہیں۔ ترجمہ میں نے کر دیا ہے۔

آپ نے یہ نص قطعی تو دیکھی کہ اللہ تعالیٰ نے قُمِ الَّیلَ اِلَّا قَلِیلًا ۝ فرمایا ہے، لیکن یہ نہیں دیکھا کہ وَالَّذِینَ یَبِیتُونَ لِرَبِّہِمۡ سُجَّدًا وَّقِیَامًا ۝ (وہ لوگ سجدہ اور قیام کی حالت میں رات گزارتے ہیں) بھی اسی قرآن کی نص قطعی ہے، آپ نے کَانُوا قَلِیلًا مِنَ الَّیلِ مَایَھۡجَعُونَ ۝ کو ملاحظہ فرمایا لیکن تَتَجَافٰی جُنُوبُھُمۡ عَنِ الۡمَضَاجِعِ (ان کے پہلو خواب گاہوں سے جدا رہتے ہیں) کو نہیں دیکھا، ثلث رہط اور حضرت سلمان فارسی کا قصہ تو دیکھا مگر اَمَّنۡ ھُوَ قَانِتٌ اٰنَآءَ الَّیلِ سَاجِدًا وَّ قَآئِمًا (کیا وہ شخص جو رات کی ساعتوں میں عبادت گزار ہوتا ہے اس حال میں کہ وہ کبھی سجدہ کرتا ہے اور کبھی کھڑا رہتا ہے) پر نظر نہیں پڑی، ان آیات کا ظاہر تو یہی ہے کہ پوری رات عبادت میں گزرے۔ اور اگر آپ ان میں تاویل کریں گے تو دوسری "نصوص قطعیہ" (جن کو آپ نے لکھا ہے) میں تاویل و تخصیص کی گنجائش ہو سکتی ہے۔

عزیزم! سخن شناس نۂ دلبرا خطا اینجاست، سخن فہمی کا سلیقہ درکار ہے، یہ عجیب بات ہے کہ ناقص علم اور ناتمام عقل والے کسی بات کا کوئی مطلب لے لیتے ہیں، اور پھر اس کی پروا نہیں کرتے کہ ان کے مطلب کی رو سے کتنی دوسری نصوص قطعیہ کا ابطال لازم آتا ہے، کتنے اکابر و اساطین کی تجہیل و تحمیق لازم آتی ہے، آج کل کے اہل قلم، شعراء و ادباء جنہوں نے دین و مذہب کو اپنی ترکتازیوں کا نشانہ بنایا ہے، ان کے یہاں اس کے نمونے بکثرت ملتے ہیں، اور جس جماعت سے آپ کی وابستگی ہے[1] اس کا تو طرۂ امتیاز یہی ہے

---

[1] غیر مقلدیت اور جماعت اسلامی، دونوں سے ان کا تعلق ہے، کریلا اور نیم چڑھا کا صحیح مصداق۔

کہ اپنی ناقص فہم کے بل بوتے پر امت کے اکابر اور اساطین پر پانی پھیرتی رہتی ہے۔

اصل حقیقت یہ ہے کہ کثرت عبادت سے جہاں منع کیا جاتا ہے، وہاں عموماً مقصود اس کی کثرت کی حرمت نہیں ہوتی، بلکہ از روئے شفقت ایسا حکم دیا جاتا ہے، تاکہ مخاطب مشقت میں نہ پڑے، اور یہ بات بالکل بدیہی ہے، جو کام باعث رضامندی ہو، اس کے ادا کرنے میں کوئی مشقت جھیل رہا ہو، تو حکم دینے والا خوشی محسوس کرتا ہے، مگر مخاطب پر شفقت کی بنا پر زیادہ جدوجہد سے باز رہنے کی تاکید کرتا ہے۔

کبھی اس لئے کثرت عبادت سے روکتے ہیں کہ کثرت کا جذبہ ہمیشہ باقی نہیں رہتا کہیں ایسا نہ ہو کہ ہمت وحوصلہ میں فتور واقع ہو اور سرے سے اس کام ہی سے طبیعت اکتا جائے، اس لئے میانہ روی کا حکم دیا جاتا ہے، اگر ان احادیث وآیات کا کوئی یہ مطلب لیتا ہے کہ سرے سے تکثیر عبادت کسی کے حق میں اور کسی وقت جائز ہی نہیں ہے۔ تو اس کی خوش فہمی ہے، آخر بعض صحابہ اور تابعین سے رات رات بھر عبادت میں مشغول رہنا صحیح نقول سے ثابت ہے یا نہیں! حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے ایک رات میں، ایک رکعت میں پورا قرآن پڑھنا منقول ہے اب یا تو آپ کی عقل کے مطابق ان سب کو خلاف سنت اور غلط کار کہیئے، یا جو کچھ نقل کیا گیا ہے، اس کو جھوٹ اور افتراء اقرار دیجئے، یہ دونوں کام آپ تو بے تکلف کر لیں گے، کیونکہ آپ کے نزدیک قابل اعتماد صرف آپ کی عقل ہے، یعنی آپ کی عقل معصوم ہے، اور باقی سب غیر

معصوم مگر ہم لوگوں کے بس کی یہ بات نہیں ہے کہ اپنی ناتمام عقل کے بل بوتے پر اتنی بڑی جرأت کریں، اور ہم ایسی عقل اور ایسے علم کو دور سے سلام کرتے ہیں، جو اکابر امت اور سلف صالحین کی پاکیزہ زندگیوں کو خلاف شریعت وسنت یا کذب وافتراء سے متہم سمجھے۔

دوسری بات یہ ہے کہ لوگ مختلف درجات کے ہوتے ہیں۔ لوگوں کے احوال علیحدہ علیحدہ ہوتے ہیں، اور سب کے احکام الگ ہوتے ہیں۔ ایک غریب ہے، دوسرا مال دار ہے کیا دونوں کا حکم یکساں ہوگا، ایک شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں بطور چندہ کے سونے کا ایک ڈلا پیش کرتا ہے، آپ ناراض ہوتے ہیں۔ اسے واپس کر دیتے ہیں۔ ایک صاحب اپنا کل مال صدقہ کرنا چاہتے ہیں۔ آپ ایک تہائی کو کل قرار دے کر اتنا ہی قبول کرتے ہیں، اور حضرت صدیق اکبر اور حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہما اپنا کل مال یا مال کی بہت بڑی مقدار پیش کرتے ہیں، اور آپ نہ صرف یہ کہ قبول کرتے ہیں، بلکہ بشارتیں بھی سناتے ہیں، تو کیا سب کا حکم یکساں ہوگا؟

صحابہ میں ہر رنگ کے لوگ رہے ہیں، بلکہ انبیاء کے بھی الوان مختلف رہے ہیں، کسی میں نرمی، کسی میں گرمی، کسی میں جلال، کسی میں جمال، کسی پر گریہ، کسی پر خندہ، اور مختلف طبائع اور درجات کے احکام الگ الگ ہوتے ہیں، اگر اس کو نہ تسلیم کیا جائے تو نصوص قرآنیہ اور احادیث نبویہ میں بہت کچھ تضاد لازم آئے گا۔

اگر امام ابو حنیفہؒ پوری رات نماز پڑھتے ہیں، عشاء کا وضو اُن کے فجر میں

کام آتا ہے اور بھی بہت سے لوگوں کا یہ حال رہا ہے تو اپنا ناتمام علم اور ادھوری عقل لے کر ان کی کھال نہ نوچیے، ان کا گوشت نہ کھائیے، ایک عام مسلمان کا گوشت، کھانے والے کے حق میں زہر ہوتا ہے، اور یہ حضرات تو اکابر امت ہیں، ان کا گوشت کتنا زہریلا ہوگا محتاجِ بیان نہیں، ان کا گوشت، اپنے کھانے والے کو کھا جائے گا۔

امام غزالیؒ نے ابو طالب مکی کے حوالے سے چالیس تابعین کے متعلق تواتر نقل کیا ہے کہ وہ عشاء کے وضو سے فجر کی نماز پڑھا کرتے تھے، اور یہ وہ لوگ تھے جو بیوی بچوں، عزیز و اقارب دوست احباب، تلامذہ واساتذہ سب کے حقوق ان لوگوں سے کہیں بہتر طریقے پر ادا کرتے تھے، جو انہیں حقوق کا نام لے کر فرائض وواجبات تک کو پامال کرتے ہیں۔ حرام چیزوں کا ارتکاب کرتے ہیں، پھر بھی ان کی طرح حقوق نہیں ادا کر پاتے۔

آپ بجائے اس کے کہ ان احادیث وآیات کو ان بزرگوں کے خلاف پیش کریں، اپنی خبر لیجیے کہ پوری رات نہ سہی، آدھی رات سہی، تہائی رات سہی، آخر کتنا حق ان آیات کا ادا کرتے ہیں، کتنا ان پر عمل کرتے ہیں، یہ آیات بزرگوں سے لڑنے کے لئے بطور اسلحہ کے نہیں نازل ہوئی ہیں، واللہ اگر عبادت کا ذرا ذوق ہوتا تو سارا اعتراض دھرا کا دھرا رہ جاتا، مت لڑیئے ان اکابر سے، ان کی بدگوئی سے بچیے، اس سے آپ کا کوئی فائدہ نہیں ہے، یہ لوگ امت کے متفق علیہ بزرگ اور نمائندے ہیں، اور ان کے سلسلے میں جو کچھ منقول ہے اس کی روایت کرنے والے معتمد اکابر ہی ہیں۔ ان پر اتہام رکھنے

کے بجائے اپنے نفس کو متہم گردانئے، اس میں زیادہ عافیت ہے۔

جو لوگ فرائض وواجبات تک میں کوتاہی کرتے ہیں، جو لوگ حرام صریح غیبت، جھوٹ، بدگوئی سے نہیں بچ پاتے ان کو کب جائز ہے کہ اکابر واسلاف پر تنقید کے تیر چلائیں۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ اکابر پر لعن وطعن کی بدعت جن لوگوں میں سرایت کر جاتی ہے ان سے اس چٹپٹی غذا کا چھوٹنا مشکل ہوتا ہے، تاہم اتنا لکھ دیا، شاید کچھ تنبیہ ہو۔

اوپر ذکر کیا گیا ہے کہ اسلامی تاریخ میں روز اول سے آج تک ہر دور میں بکثرت ایسے لوگ پائے گئے ہیں، جو کثرت عبادت میں ممتاز رہے ہیں، اور ہر زمانہ میں یہ عمل بلا نکیر جاری رہا ہے، نکیر کیا معنی؟ یہی حضرات امت کے نزدیک زہد وتقوی اور دینداری وعزیمت کے بلند مقام پر فائز رہے ہیں، مسلمانوں نے انہیں نظر قبول سے دیکھا ہے، صالحین نے ان کے قدموں کے نیچے عقیدت کی آنکھیں بچھائی ہیں، علماء نے ان کی صحبت ومعیت کو غنیمت سمجھا ہے انہیں امت کے خواص اور اخص الخواص میں شمار کیا گیا ہے، آج کے دور تاریک سے پہلے شاید کسی کو خیال آتا رہا ہو کہ جو لوگ اللہ کی عبادت میں خود کو کھپاتے ہیں، راتوں کو قیام وسجود میں گزار دیتے ہیں، دنوں میں بکثرت روزے رکھتے ہیں۔ حج پر حج کرتے ہیں۔ صدقات نافلہ میں تیز گام ہیں، شاید کوئی تصور کرتا ہو کہ یہ کسی بدعت کے مرتکب ہیں۔ اگر کسی دماغ میں یہ وسوسہ آتا بھی رہا ہوگا، تو اسے کہنے کی ہمت نہ کرتا رہا ہوگا۔ اور اگر کسی نے ہمت کر کے ایسی بات کہہ بھی دی ہوگی، تو امت نے حلق کی مکھی کی طرح

نکال باہر کیا ہوگا۔

ہم یہاں چاہتے ہیں کہ امت کے کچھ ان خواص کا ذکر کردیں، جن کی بزرگی، ان کا علم وفضل اور ان کا کمال وجمال مسلم ہے، تاکہ ناواقفوں کا دیدۂ عبرت وا ہو، اور واقف کاروں کے لئے مزید اطمینان اور تقویت ایمان کا سبب بنے، حضرت مولانا عبدالحئی صاحب فرنگی محلیؒ نے اپنی تالیف "اقامة الحجة" میں ایسے چند حضرات کا تذکرہ کیا ہے۔ ہم پہلے اس کتاب میں مذکور حضرات کا ذکر کرتے ہیں، بعد میں کچھ اور بزرگوں کا ذکر کریں گے۔ انشاء اللہ۔

حضرات صحابہ (رضی اللہ عنہم) جو کثرت عبادت میں ممتاز تھے

(۱) صاحب الحیاء والعرفان سیدنا عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ

حافظ ابونعیم اصبہانی نے اپنی کتاب حلیۃ الاولیاء میں نقل کیا ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ ہمیشہ روزہ رکھتے تھے، یعنی صائم الدھر تھے، اور پوری رات نماز پڑھتے تھے صرف ابتدائے شب میں تھوڑی دیر سو لیتے تھے۔

عبدالرحمٰن تیمی ایک تابعی ہیں، انہوں نے ایک رات مقام ابراہیم پر نماز پڑھنے کا قصد کیا، اور سوچا کہ آج میں وہاں ضرور پہنچ کر رہوں گا۔ (شائقین چونکہ وہاں پہنچنے اور اس جگہ نماز پڑھنے کے لئے ہجوم کئے رہتے ہیں، اس لئے انہوں نے ایسا فرمایا) فرماتے ہیں کہ عشاء کی نماز پڑھ کر جب میں مقام ابراہیم کے پاس پہنچا، ابھی کھڑا ہی تھا کہ پیچھے سے کسی نے میرے دونوں کاندھوں کے درمیان ہاتھ رکھا، میں نے پلٹ کر دیکھا تو وہ امیرالمومنین

حضرت عثمان بن عفان تھے (میں ہٹ گیا اور انہوں نے نماز کی نیت باندھ لی) انہوں نے سورۂ فاتحہ سے تلاوت شروع کی، اور ایک ہی رکعت میں، پورا قرآن ختم کرلیا، اس کے بعد رکوع کیا، پھر سجدہ کیا (اور سلام پھیر کر) جوتا لے کر چل دیے، مجھے نہیں معلوم کہ اس ایک رکعت سے پہلے کچھ پڑھا تھا یا نہیں۔

ملاحظہ فرمایئے، یہ صحابی رسول ہیں، عشرہ مبشرہ میں سے ہیں، تیسرے امیر المومنین ہیں، افضلیت میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے نزدیک تیسرا مرتبہ رکھتے ہیں۔ یہ ایک ہی رکعت میں سورۂ فاتحہ سے لے کر والناس تک پڑھ جاتے ہیں۔ کیا ان پر بھی ہمارے مہربان ہتھیار لے کر دوڑیں گے، اور ان کے اس عمل کو غلط قرار دیں گے۔

اور خوب سمجھ لینا چاہیئے کہ یہ کسی ایک رات کا قصہ نہیں ہے، ابھی پہلی روایت میں آپ یہ پڑھ چکے ہیں کہ وہ پوری رات نماز پڑھتے تھے، یہ اس کا ایک نمونہ ہے۔

بعض دوستوں کو یہ شبہ ہوگا کہ رات میں پورا قرآن پڑھ لینا کیسے ممکن ہوگا۔ تو اُن کی خدمت میں عرض ہے اللہ تعالیٰ جس طرح مال اور کھانے میں برکت عطا فرماتے ہیں۔ یعنی تھوڑے مال میں بابرکت آدمی کا اتنا کام ہوجاتا ہے جتنے کام کے لئے ایک عام آدمی کو بہت زیادہ مال خرچ کرنا پڑتا ہے، اسی طرح اہل برکت کے دسترخوان پر تھوڑا سا کھانا اتنے آدمیوں کے پیٹ بھرتا ہے، کہ عام حالات میں اس کا تصور نہیں کیا جاسکتا، اسی طرح اللہ تعالیٰ بزرگوں کے اوقات میں بھی برکت رکھ دیتے ہیں۔ ان سے تھوڑے وقت میں بہت کام

ہوجاتا ہے، اس موضوع پر انشاء اللہ آئندہ مفصل گفتگو ہوگی۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے ایک رکعت پر نماز پوری کردی، ان کے نزدیک ایک رکعت کی نماز معتبر ہے اور ان کے اتباع میں بعض ائمہ کی یہی رائے ہے۔

تیسری روایت

حضرت محمد بن سیرین رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ جب بلوائیوں اور باغیوں نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا محاصرہ کیا، اور وہ ان کے قتل کے درپے ہوئے۔ تو اُن کی بیوی نے کہا کہ تم ان کو قتل کرو یا چھوڑو، لیکن یہ خوب سمجھ لو، وہ پوری رات ایک رکعت میں گزار دیتے تھے، اور اس میں ایک ختم قرآن پڑھ لیتے تھے۔

(۲) الناطق بالحق والصواب سیدنا عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ

حافظ ابن کثیر البدایۃ والنہایہ میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے حالات میں لکھتے ہیں کہ:-

”وہ عشاء کی نماز پڑھا کر گھر میں داخل ہوتے اور صبح تک مسلسل نماز پڑھتے رہتے، اور انتقال سے پہلے ان کا معمول مسلسل روزہ رکھنے کا ہوگیا تھا۔“

(۳) حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما

حافظ ابونعیم نے حلیۃ الاولیاء میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کے مشہور شاگرد اور آزاد کردہ غلام حضرت نافع سے نقل کیا ہے کہ حضرت

عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ رات بھر نماز پڑھتے رہتے، پھر پوچھتے کہ اے نافع کیا صبح ہوگئی؟ وہ کہتے کہ نہیں، اس پر وہ پھر نماز پڑھنے لگتے، کچھ دیر کے بعد پھر پوچھتے کہ اے نافع کیا صبح ہوگئی، وہ عرض کرتے جی ہاں۔ اس پر وہ بیٹھ کر استغفار کرتے اور نماز فجر تک دعا کرتے رہتے۔

دوسری روایت

یہی حضرت نافع فرماتے ہیں کہ اگر کبھی حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ کی عشاء کی جماعت فوت ہوجاتی، تو باقی رات نماز پڑھتے رہتے۔

(۴) حضرت تمیم بن اوس الداری رضی اللہ عنہ

ابوسعد سمعانی نے کتاب الانساب میں لکھا ہے کہ حضرت تمیم رضی اللہ عنہ ایک رکعت میں قرآن ختم کرتے تھے، اور بعض اوقات ایک ہی آیت کو رات بھر دہراتے رہتے ان کا شمار ان صحابہ میں ہے، جو نہایت درجہ عابد وزاہد تھے، دنیاوی عزوجاہ کے اسباب سے احتراز کرتے، اور عبادت کے لئے خلوت کو اختیار کئے ہوئے تھے، اور اسی حالت میں ان کا انتقال ہوا۔

مشہور تابعی حضرت مسروقؒ فرماتے ہیں کہ ایک رات حضرت تمیم داری رضی اللہ عنہ نے نماز شروع کی اور صبح تک اس میں یہ آیت دہراتے رہے۔ اَمْ حَسِبَ الَّذِیْنَ اجْتَرَحُوا السَّیِّاٰتِ اَنْ نَّجْعَلَهُمْ كَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصَّالِحَاتِ سَوَآءً مَّحْیَاهُمْ وَمَمَاتُهُمْ ط سَآءَ مَا یَحْكُمُوْنَ ۝ کیا جو لوگ برائیوں کا ارتکاب کرتے ہیں، انھوں نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ ہم ان کے ساتھ وہی معاملہ کریں گے، جو ایمان لانے والوں اور عمل صالح کرنے والوں کے

ساتھ کریں گے ان کا تو مرنا جینا برابر ہے، کتنا برا فیصلہ کرتے ہیں۔ (خلاصہ للخزرجی[1])

مشہور محدث علامہ ابن حجر مکی نے بھی فتح المبین بشرح الاربعین میں نقل کیا ہے کہ حضرت تمیم داری رضی اللہ عنہ ایک رکعت میں ایک ختم قرآن پاک پڑھا کرتے تھے۔

(۵) حضرت شداد بن اوس رضی اللہ عنہ

حافظ ابو نعیم نے حلیۃ الاولیاء میں اسد بن وداعہ سے نقل کیا ہے کہ حضرت شداد بن اوس انصاری رضی اللہ عنہ بستر پر لیٹتے تو کروٹ بدلتے رہتے، نیند نہ آتی، وہ کہتے کہ یا اللہ جہنم (کے خوف) نے میری نیند اڑادی ہے، پھر وہ کھڑے ہوجاتے، اور صبح تک نماز پڑھتے رہتے۔

(۶) امیر المومنین حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ

بخاری کے بعض شارحین نے ذکر کیا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ دن بھر میں آٹھ ختم قرآن پاک پڑھ لیتے تھے۔

آٹھ ختم قرآن چوبیس گھنٹے میں پڑھنا بظاہر مستبعد معلوم ہوتا ہے، لیکن جن کو بزرگوں اور اہل اللہ کے وقت کی برکت کا علم ہے، ان کے نزدیک ایسا ہونا کچھ بعید نہیں ہے۔ اس سلسلے میں مفصل کلام آگے آرہا ہے۔ انشاء اللہ۔

---

[1] تعلیق عبد الفتاح ابو غدہ علی اقامۃ الحجہ ص ۹۳

حضرات تابعین رحمہم اللہ تعالیٰ

(۱) حضرت عمیر بن ہانی رحمہ اللہ

امام ترمذی نے سنن ترمذی کی کتاب الدعاء میں مسلمہ بن عمر سے نقل کیا ہے کہ عمیر بن ہانی ہر روز ایک ہزار رکعت نماز پڑھا کرتے، اور ایک لاکھ مرتبہ سبحان اللہ کہتے۔

(۲) سید التابعین حضرت اویس قرنی رحمہ اللہ

یہ وہ بزرگ ہیں جن سے دعاء و استغفار کرانے کا حکم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اصحاب کو دیا تھا، انکے بارے میں حلیۃ الاولیاء ص ۸۷ ج ۲ میں حافظ ابونعیم نقل فرماتے ہیں کہ جب شام ہوتی تو یہ فرماتے کہ آج رکوع کی رات ہے، پھر صبح تک رکوع میں رہتے، کسی دن فرماتے کہ آج سجدہ کی رات ہے، پھر صبح تک وہ رات سجدے میں گذار دیتے۔

(۳) حضرت عامر بن عبد اللہ بن قیس رحمہ اللہ

حافظ ابونعیم نے حلیۃ الاولیاء ص ۸۸ ج ۲، میں ابن وہب وغیرہ سے نقل کیا ہے کہ عامر بن عبد اللہ افضل العابدین تھے، اپنے اوپر ہر روز ایک ہزار رکعت مقرر کر رکھی تھی۔

(۴) تابعی جلیل حضرت مسروق بن عبد الرحمٰن کوفی رحمہ اللہ

یہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے خاص تلامذہ میں تھے۔

حافظ ابونعیم نے حلیۃ الاولیاء صفحہ ۹۵ ج ۲۷ میں ابواسحاق سے نقل کیا ہے کہ حضرت مسروق حج میں تشریف لے گئے، تو ان کی ہر رات سجدے ہی میں گزری، یعنی رات میں آرام کرنے اور سونے کا کوئی ذکر ہی نہ تھا، کثرت سے نماز ادا کرتے اور سجدے کرتے۔

شیخ الاسلام حافظ ذہبی اپنی کتاب العبر با خبار من غبر صفحہ ۶۸ ج ۱ میں تحریر فرماتے ہیں کہ مسروق اس قدر نماز پڑھتے تھے کہ ان کے دونوں پاؤں پھول جاتے تھے، اور جب حج کیا، تو اگر ان کو نیند آتی، تو سجدہ ہی کی حالت میں آتی، مطلب یہ کہ مسلسل نماز پڑھتے، نیند کی گنجائش بالکل نہ تھی، اگر آتی، تو انہیں سجدے کی حالت میں پاتی اسی طرح کی روایت امام یافعی کی مرأۃ الجنان صفحہ ۱۳۹ ج ۱ میں بھی ہے۔

اور تاریخ ابن کثیر میں امام احمد کا قول نقل کیا گیا ہے کہ حضرت مسروق نے حج کیا، تو اگر ان کو نیند آئی تو حالت سجدہ ہی میں آئی، واپسی تک یہی حال رہا، کثرت سے نماز پڑھنے کی وجہ سے ان کے پیروں میں ورم آگیا تھا۔ حضرت مسروق کی بیوی نے فرمایا، کہ جب بھی انہیں دیکھا جاتا، تو لمبی لمبی نمازوں کی وجہ سے ان کی پنڈلیوں پر ورم ہی ملتا تھا۔ [1]

---

[1] اس نقل و حکایات پر شیخ عبد الفتاح ابوغدہ تحریر فرماتے ہیں کہ حافظ ابن کثیر نے اپنی کتاب البدایہ و النہایہ ص ۲۲۴ ج ۸ میں محض ان کی وفات کا تذکرہ کیا ہے، یہ عبارت اس میں نہیں ہے، شاید کسی اور جگہ ہو، اور یہ بھی ممکن ہے مطبوعہ نسخہ سے اتنی عبارت ساقط ہوگئی ہو۔ التعلیق علی اقامۃ الحجۃ ص ۶۷

(۵) حضرت اسود بن یزید نخعی کوفی رحمہ اللہ

یہ بھی حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے اخص تلامذہ میں تھے امام ذہبی اور امام یافعی دونوں نے لکھا ہے۔ امام ذہبی نے العبر صفحہ ۸۶۔ ج ۱ میں اور امام یافعی نے مرأۃ الجنان صفحہ ۱۵۶، ج ۱ میں لکھا ہے کہ حضرت اسود رات اور دن میں سات سو رکعت نماز پڑھتے تھے۔

اور حلیۃ الاولیاء میں حضرت ابراہیم نخعی سے منقول ہے کہ حضرت اسود رمضان شریف میں دو راتوں میں قرآن ختم کیا کرتے تھے، اور مغرب و عشاء کے درمیان سوتے تھے، اور رمضان کے علاوہ ایام میں چھ دنوں میں ایک ختم مکمل کرتے۔

(۶) امام التابعین حضرت سعید بن مسیّب رحمہ اللہ

حافظ ابونعیم نے حلیۃ الاولیاء میں نقل کیا ہے کہ حضرت سعید بن مسیّب نے پچاس سال تک عشاء کے وضو سے فجر کی نماز پڑھی ہے۔

(۷) حضرت عروہ بن زبیر رحمہ اللہ

یہ ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے بھانجے اور ان کے تلمیذ خاص ہیں، ان کے متعلق امام ذہبی نے لکھا ہے ہر روز مصحف میں دیکھ کر ایک چوتھائی قرآن یعنی ساڑھے سات پارے پڑھتے تھے، پھر وہی ساڑھے سات پارے رات میں نوافل میں تلاوت فرماتے، یہ ان کا دائمی معمول تھا اس میں کبھی ناغہ نہیں ہوتا تھا۔ البتہ جس روز ان کا پاؤں کاٹا گیا تھا، اس روز مجبوری کی وجہ سے اس معمول کا ناغہ ہو گیا تھا۔

یہاں سلسلۂ گفتگو کو ذرا اپنے موضوع سے ہٹا کر ہم حضرت عروہ بن زبیر کے پاؤں کے کاٹے جانے کی تفصیل ذکر کرنا چاہتے ہیں، اسے پڑھ کر اندازہ ہوگا، ہمارے اسلاف کی شان کچھ اور ہی تھی، ہم اپنے حالات وکیفیات پر اگر ان کو قیاس کریں گے اور اسی بنیاد پر تاریخ اسلامی کو پرکھیں گے، تو یہ تاریخ پر ظلم ہوگا، اسلاف کی ناقدر شناسی ہوگی، اور ہماری بدترین حرماں نصیبی ہوگی۔ یہ تفصیل مشہور مؤرخ ابن خلکان نے وفیات الاعیان صفحہ ۴۱۹۔ ج ۲ میں ذکر کی ہے شیخ عبدالفتاح ابوغدہ نے تعلیقات علی اقامۃ الحجہ میں اسے نقل کیا ہے۔ واقعہ کی تفصیل یہ ہے کہ:

حضرت عروہ بن زبیر اپنے بیٹے محمد بن عروہ کو ساتھ لے کر مدینہ سے ملک شام ولید بن عبدالملک کے پاس تشریف لائے۔

ایک روز محمد بن عروہ اصطبل میں چلے گئے، وہاں ایک گھوڑے نے بڑی سخت لتی چلائی جس کے نتیجے میں محمد بن عروہ کی موت واقع ہوگئی، پھر حضرت عروہ کے پاؤں میں ایک سخت قسم کا پھوڑا ہوگیا، ان سے ولید نے کہا کہ آپ کا پاؤں کاٹنا ضروری ہے، ورنہ سارے بدن میں زہریلا مادہ سرایت کر جائے گا، انہوں نے منظور کرلیا ولید نے جراح کو طلب کیا۔ لوگوں نے کہا کہ ہم آپ کو شراب پلائیں گے، تاکہ آپ کو پاؤں کاٹنے کی تکلیف نہ محسوس ہو، انہوں نے فرمایا کہ میں جس عافیت کا امیدوار ہوں، اس کے لئے کسی حرام چیز کی مدد نہیں لے سکتا، لوگوں نے کہا، آپ کوئی خواب آور دوا کھالیں۔ فرمایا کہ مجھے یہ بات پسند نہیں، کہ میرا کوئی عضو بدن کاٹا جائے، اور اس کی تکلیف کی وجہ سے مجھے جو

ثواب ملنے والا ہے، اسے میں اس طرح ضائع کردوں۔ اس کے بعد ان کے پاس کچھ اجنبی لوگ آئے، فرمایا کہ یہ کون لوگ ہیں؟ لوگوں نے بتایا کہ یہ آپ کو پکڑے رہیں گے، مبادا تکلیف کی شدت کی وجہ سے صبر و قرار رخصت ہوجائے، فرمایا کہ اس کی ضرورت نہیں ہے، میں انشاء اللہ سکون سے رہوں گا۔ اس کے بعد ان کا ٹخنہ چھری سے کاٹا جانے لگا۔ جب ہڈی کی نوبت آئی، تو آری استعمال کی گئی، اس دوران وہ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ اور اَللّٰهُ اَكْبَرُ پڑھتے رہے اور کسی کو پکڑنے اور تھامنے کی ضرورت نہیں پیش آئی، پاؤں ٹخنہ سے الگ کردیا گیا پھر کھولتے ہوئے تیل میں کٹے ہوئے پاؤں کو داغا گیا، تاکہ خون بند ہوجائے، اس وقت وہ بے ہوش ہوگئے۔ جب ہوش میں آئے تو چہرے سے پسینہ پونچھتے ہوئے فرمایا لَقَدْ لَقِيْنَا مِنْ سَفَرِنَا هٰذَا نَصَبًا ہم کو اپنے اس سفر میں بہت تکلیف جھیلنی پڑی۔

پھر جب انہوں نے اپنے قدم کو دوسروں کے ہاتھ میں دیکھا، تو اسے مانگا اور ہاتھ میں لے کر اسے الٹا پلٹا، اور فرمایا کہ قسم ہے اس ذات کی، جس نے تیرے اوپر مجھے سوار کیا تھا۔ وہ جانتا ہے، کہ میں تمہارے ذریعے کسی حرام کی طرف نہیں چلا ہوں۔

اس سے بھی عجیب

اتفاق ایسا کہ اسی سال بنی عبس کے کچھ لوگ ملک شام آئے، ان میں ایک نابینا شخص بھی تھا۔ ولید نے اس کی آنکھ کے متعلق دریافت کیا، اس نے کہا کہ اے امیر المومنین میں ایک روز ایک وادی میں پڑاؤ ڈالے ہوئے تھا۔ وہیں

میرے اہل وعیال اور مال ومنال سب کچھ تھا اور بنی عبس میں مجھ سے زیادہ کوئی مالدار نہ تھا۔ رات میں اچانک سیلاب آیا اور اہل وعیال اور مال ومتاع سب کو بہالے گیا، صرف میں بچا، اور ایک اونٹ محفوظ رہ گیا اور میرا ایک نومولود بچہ زندہ بچ گیا، اونٹ بڑا تندخو اور بدمزاج تھا۔ ایک بار وہ بدک کر بھاگا۔ میں نے اسے پکڑنے کے لئے بچہ کو زمین پر لٹادیا۔ اور اونٹ کے پیچھے دوڑا۔ ابھی کچھ ہی دور گیا تھا کہ بچے کی چیخ سنائی دی، پیچھے پلٹ کر دیکھا تو اس کا سر بھیڑیے کے منہ میں تھا، وہ اسے کھا رہا تھا، میں نے دیکھا کہ بچہ تو ختم ہی ہوگیا ہے، اونٹ ہی کو پکڑلوں، اس کے قریب گیا، تو اس نے اپنے پاؤں سے میرے چہرے پر اس زور سے مارا کہ میری آنکھیں بہہ گئیں۔ اب میرا یہ حال ہے کہ میرے پاس نہ اہل ہے نہ اولاد اور نہ آنکھیں، ولید نے کہا کہ اسے عروہ بن زبیر کے پاس لے جاؤ وہ بھی دیکھ لیں کہ دنیا میں ایسے لوگ بھی ہیں، جن کی مصیبت ان کی تکلیف سے بہت زیادہ ہے۔

مؤمنانہ جذبہ

حضرت عروہ جب مدینہ واپس ہوئے تو انہوں نے بارگاہ الٰہی میں عرض کی کہ بارالہا میرے ہاتھ پاؤں چار تھے، آپ نے ایک لے لیا، اور تین باقی رکھے، آپ کا شکر ہے، الحمدللہ، اللہ کی قسم! اگر آپ نے لیا ہے، تو باقی بھی چھوڑا ہے، اور اگر آپ نے مبتلائے مصیبت کیا ہے تو اس سے بدر جہا زائد عافیت بھی نصیب فرمائی ہے۔ ایمان کی یہ شان ہوتی ہے، بات یہ ہے کہ ان کی نظر میں اللہ کی عظمت تھی، دل میں اللہ کی گہری محبت تھی، ایمان ان کے

پورے وجود پر چھایا ہوا تھا، بلکہ رگ وریشے میں سمایا ہوا تھا، دُنیوی راحت وکلفت اور مسرت وغم ان کی نگاہوں سے ساقط ہو چکے تھے، حوصلہ جب بلند ہوتا ہے تو ایسے ہی حیرتناک واقعات ظاہر ہوتے ہیں، اور جب حوصلے پست ہو جاتے ہیں تو صرف دوسروں کی کھال نوچنے کا مشغلہ رہ جاتا ہے۔

مولانا مُفتی محمد حسن صاحب امرتسریؒ

موضوع سے گفتگو ذرا ہٹ گئی ہے، تو اس کی طرف واپس ہونے سے پہلے زمانۂ حال کے دو اصحاب عزیمت کے ایسے ہی واقعات ملاحظہ فرمالیں۔ اسلاف کی قدر وعظمت دل میں آجائے، تو اللہ تعالیٰ کی بہت بڑی نعمت ہاتھ آجائے۔

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی قدس سرہٗ کے خلفاء میں حضرت مولانا مفتی محمد حسن صاحب امرتسری علیہ الرحمۃ بڑی شان کے بزرگ تھے ہو بہو حضرت تھانویؒ کے نقش قدم پر تھے، وہ فیل پاؤں کے مریض تھے پھر اسی میں پھوڑا بھی ہو گیا، جو اندر اندر بڑھتا رہا۔ اور خطرناک صورت اختیار کر گیا، ڈاکٹروں نے تجویز کیا کہ پاؤں ران سے کاٹنا ہوگا، مفتی صاحب نے قبول کر لیا، آپریشن کے کمرے میں لے جائے گئے، کلوروفارم لایا گیا پوچھا کہ یہ کیا ہے، لوگوں نے بتایا کہ آپ کو بے ہوش کرنا ہے، آپریشن لمبا ہے، فرمایا نہیں اس کی ضرورت نہیں، آپ تکئے کے سہارے نیم دراز ہو گئے۔ ہاتھ میں تسبیح لے لی، پاؤں کٹتا رہا، تسبیح پڑھتے رہے ڈاکٹروں نے احتیاط بھی کی، عجلت بھی کی، مفتی صاحب کو تکلیف بھی محسوس ہوتی رہی، لیکن صبر کئے بیٹھے رہے۔

بعد میں کسی نے پوچھا کہ حضرت آپ کو تکلیف نہیں ہو رہی تھی، فرمایا تکلیف کیوں نہ ہوتی، لیکن اس تکلیف پر اللہ تعالیٰ کے یہاں جو اجر وثواب ملنے والا تھا، میں اس کی لذت میں اس سے غافل رہا، اللّٰہ اکبر، یہ واقعہ حضرت مولانا شاہ وصی اللہ صاحبؒ اپنی مجالس میں بکثرت سناتے تھے، ''بیس بڑے مسلمان'' میں یہ واقعہ مفصل دیکھا جا سکتا ہے۔

مولانا مفتی محمود صاحبؒ

پاکستان میں ابھی چند سال ہوئے مفتی محمود صاحبؒ کا وصال ہوا ہے، ان کے پاؤں کے انگوٹھے میں تکلیف تھی، اس کا کاٹنا تجویز ہوا۔ بے ہوش کیے جانے کی تجویز انہوں نے بھی مسترد کر دی، انگوٹھا اسی ہوش وحواس کی حالت میں کاٹا گیا۔ مفتی محمد تقی صاحب عثمانی نے دریافت کیا کہ حضرت مفتی محمد حسن صاحب علیہ الرحمۃ کا پاؤں کاٹا گیا تھا، تو وہ اس کے اجر وثواب کی دید ولذت میں محو ہو گئے تھے۔ آپ کا بھی یہی حال رہا؟ فرمایا کہ نہیں بھائی! وہ بڑے لوگ تھے ان کے قلوب مصفا تھے، میرا یہ رتبہ کہاں، میں نے تو یہ سوچا کہ خدانخواستہ اگر انگوٹھا کاٹنے میں میری موت واقع ہو گئی، تو بے ہوشی میں موت واقع ہو گی، اور مجھے کلمہ پڑھنا بھی اس وقت نصیب نہ ہو گا۔ اسی خیال سے میں نے بے ہوش کرنے کی اجازت نہیں دی۔

یہ حضرات واقعی اسلاف کے سچے جانشین تھے، ایمان کے رسوخ نے اس قدر سخت تکلیف جھیلنے کو گوارا بنا دیا۔ اللہ تعالیٰ ان کی قبروں کو نور سے بھر دے

اب ہم اپنے موضوع کی طرف لوٹتے ہیں۔

(۸) حضرت صلہ بن اشیم رحمہ اللہ

حضرت مالک بن مغول کہتے ہیں کہ بصرہ میں تین عبادت گزار تھے، صلہ بن اشیم، کلثوم بن اسود اور ایک اور شخص، صلہ بن اشیم کا دستور یہ تھا کہ جب رات ہوتی تو یہ جھاڑیوں کے ایک جھنڈ میں چلے جاتے، اور وہاں اللہ کی عبادت میں مصروف رہتے، یہ کام وہ نہایت خاموشی سے کرتے، لیکن ایک آدمی نے اسے سمجھ لیا، ایک دن وہ آدمی چھپ کر حضرت اشیم کی عبادت کو دیکھنے کے لئے گیا، اس نے دیکھا کہ ایک درندہ ان کے پاس آیا۔ حضرت صلہ نے اس سے فرمایا کہ جا اپنی روزی تلاش کر، یہ سن کر وہ چلا گیا، پھر وہ اپنی عبادت میں لگ گئے، جب صبح ہوئی تو مناجات میں انہوں نے عرض کی، یا اللہ! صلہ اس لائق تو نہیں کہ آپ سے جنت کا سوال کرے لیکن جہنم سے حجاب کا سوال کرتا ہوں۔ (حلیۃ الاولیاء صفحہ ۲۴۰۔ ج۲)

(۹) حضرت ثابت بن اسلم بنانی رحمہ اللہ

ابوسعد سمنانی نے لکھا ہے کہ یہ بصرہ کے رہنے والے تابعی تھے، حضرت عبداللہ بن عمر اور حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما سے روایت کرتے ہیں، اور حضرت انس رضی اللہ عنہ کی صحبت میں چالیس سال رہے، بصرہ میں سب سے بڑے عابد تھے ۱۲۷ھ میں ان کا وصال ہوا۔

حافظ ابونعیم نے حضرت سنان سے نقل کیا ہے، وہ فرماتے ہیں کہ میں

نے حضرت ثابت کو قبر میں اتارا تھا، میرے ساتھ حمید طویل یا کوئی اور شخص تھے۔ یہ شک سنان کے بیٹے محمد کو ہوا ہے، جنہوں نے اپنے والد سے یہ روایت نقل کی ہے۔ جب ہم نے مٹی برابر کرلی، تو لحد کی ایک اینٹ گرگئی۔ اور لحد کھل گئی، ہم نے دیکھا کہ وہ قبر میں کھڑے نماز پڑھ رہے ہیں، میں نے اپنے ہمراہی سے کہا دیکھ نہیں رہے ہو؟ انہوں نے کہا خاموش! پھر اینٹ لگا کر ہم نے مٹی برابر کردی، دفن سے فراغت کے بعد ہم ان کی صاحبزادی کی خدمت میں آئے۔ اور ان سے پوچھا کہ آپ کے والد گرامی کا کیا عمل رہا ہے؟ انہوں نے پوچھا کہ تم لوگوں نے کیا دیکھا؟ ہم نے پورا واقعہ بتایا، کہنے لگیں پچاس سال انہوں نے پوری رات عبادت کی ہے، جب صبح ہوتی تو کہتے کہ اے اللہ اگر آپ کسی کو قبر میں نماز پڑھنے کی اجازت دیتے ہوں، تو مجھے ضرور اجازت دیجئے گا۔ اللہ تعالیٰ ان کی دعا کیونکر رد کرتے۔

حضرت شعبہ فرماتے ہیں کہ وہ چوبیس گھنٹے میں قرآن مجید ختم کیا کرتے تھے، اور روزہ ہمیشہ رکھتے تھے۔ (حلیۃ الاولیاء صفحہ ۲۱۹ جلد ۲)

(۱۰) حضرت علی بن حسین زین العابدین رحمہ اللہ

یہ خانوادہ نبوت کے مشہور ومعروف عابد وزاہد بزرگ ہیں، سیدنا حسین رضی اللہ عنہ کے فرزند گرامی امیر المومنین حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے پوتے ہیں کثرت عبادت اور بذل وسخاوت میں اونچا مقام رکھتے تھے، ان کے بارے میں حافظ ذہبی نے امام مالک کا قول نقل کیا ہے کہ مرتے دم تک چوبیس گھنٹے

میں ایک ہزار رکعت نماز پڑھا کرتے تھے، وہ یہ بھی فرماتے تھے کہ ان کی عبادت ہی کی وجہ سے ان کا لقب زین العابدین ہوا۔ (العبر صفحہ ۱۱۱ جلد ۱)

(۱۱) حضرت قتادہ بن دعامہ رحمہ اللہ

حضرت قتادہ ہر سات دن میں ایک ختم قرآن مجید پڑھتے تھے، اور جب رمضان شریف آتا تو ہر تین دن میں ایک ختم پڑھتے اور عشرۂ اخیرہ میں یعنی رمضان کی آخری دہائی میں ہر رات میں ایک ختم پڑھتے۔ (حلية الاولياء صفحہ ۳۳۸ جلد ۲)

(۱۲) حضرت سعید بن جبیر رحمہ اللہ

منقول ہے کہ حضرت سعید بن جبیر نے حرم شریف میں ایک رکعت میں پورا قرآن مجید پڑھا، ایک صاحب ہیں وقاء بن ابی ایاس، وہ فرماتے ہیں کہ ایک رمضان میں حضرت سعید بن جبیر نے فرمایا کہ لو قرآن مجید دیکھو، پھر انہوں نے سنانا شروع کیا، اور ایک ہی مجلس میں پورا قرآن مجید سنا دیا۔ (مرأة الجنان لليافعي صفحہ ۱۹۷ جلد ۱)

اسماعیل بن عبدالملک فرماتے ہیں کہ حضرت سعید بن جبیر رمضان شریف میں تراویح کی امامت کرتے، ایک دن حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی قرأت پڑھتے، اور دوسرے دِن حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کی قرأت پڑھتے۔

ہلال بن یسار فرماتے ہیں کہ حضرت سعید بن جبیر حرم کعبہ میں داخل

ہوئے اور ایک رکعت میں پورا قرآن مجید پڑھا، اور ان کے بارے میں بعض لوگوں نے یہ بھی کہا ہے کہ وہ ہر دو روز میں ایک ختم قرآن مجید پڑھا کرتے تھے، امام ذہبی نے طبقات القراء میں اسے ذکر کیا ہے۔ (اعلام الاخبار فی طبقات فقهاء مذهب النعمان المختار لمحمود بن سليمان الكفوى)

(۱۳) حضرت محمد بن واسع رحمہ اللہ

موسیٰ بن یسار کہتے ہیں کہ میں مکہ سے بصرہ تک حضرت محمد بن واسع کی صحبت میں رہا، وہ تمام رات نماز پڑھتے رہتے، اونٹ کی پشت پر محمل میں اشارہ سے نوافل پڑھا کرتے، کبھی رات کے اخیر حصے میں اونٹ سے اتر کر پڑاؤ ڈالتے اور نماز میں لگ جاتے، جب صبح ہوتی اپنے رفقاء کو ایک ایک کر کے نماز کے لئے بیدار کرتے۔ (حلية الاولياء صفحہ ۳۴۶ جلد ۲)

اس کے باوجود خوف وخشیت اور تواضع کا یہ عالم تھا کہ جب ان سے صبح کو پوچھا جاتا کہ کیا حال ہے، تو فرماتے قريباً اجلى بعيداً املى، مسيئا عملى، موت قریب ہے، امید بعید ہے، عمل برا ہے۔ (حلية الاولياء صفحہ ۳۴۶ جلد ۲)

(۱۴) حضرت مالک بن دینار رحمہ اللہ

حضرت مالک بن دینار کے داماد مغیرہ بن حبیب فرماتے ہیں کہ میں نے ایک بار مالک بن دینار کے ساتھ عشاء کی نماز پڑھی، پھر انہوں نے کچھ تناول فرمایا اس کے بعد نماز کے لئے کھڑے ہو گئے۔ نماز میں ثنا کے بعد انہوں نے

یہ دعا شروع کی اذا جمعت الاولین والآخرین فحرم شیبة مالك علی النار۔ اے اللہ آپ جب اولین وآخرین کو جمع کریں گے، تو مالک کے سفید بالوں کو آگ پر حرام کر دیجئے۔ انہوں نے اتنی دیر تک اس دعا کو دہرایا کہ مجھے نیند آنے لگی، پھر جب میری آنکھ کھلی تو وہ ابھی اسی کی تکرار کئے جا رہے تھے، یہاں تک کہ صبح ہوگئی۔ (حلیة الاولیاء صفحہ۳۶۱ جلد۲)

(۱۵) حضرت سلیمان بن طرخان التیمی رحمہ اللہ

حضرت سلیمان تیمی نے بصرہ کی جامع مسجد میں چالیس سال تک امامت کی، وہ عشاء اور فجر کی نماز ایک ہی وضو سے ادا کرتے تھے۔ (حلیة الاولیاء ص ۲۹ ج۳)

(۱۶) حضرت منصور بن زاذان رحمہ اللہ

ہشام بن حسان فرماتے ہیں کہ میں اور منصور دونوں نماز پڑھا کرتے تھے، جب رمضان شریف کا مہینہ آتا، تو وہ عشاء اور مغرب کے درمیان دو ختم پڑھتے، اور اسکے بعد عشاء کی جماعت کھڑی ہونے تک طٰسٓ (یعنی سورۂ نمل تک) پڑھ لیتے اس وقت لوگ رمضان شریف میں عشاء کی نماز چوتھائی رات گزرنے پر پڑھا کرتے تھے، انھیں ہشام بن حسان سے ایک دوسری سند سے منقول ہے، وہ فرماتے ہیں کہ میں نے منصور کے قریب مغرب و عشاء کے درمیان نوافل پڑھیں۔ اتنی دیر میں انھوں نے ایک ختم قرآن پڑھا اور مزید سورۂ نمل تک پڑھا۔

ہوئے اور ایک رکعت میں پورا قرآن مجید پڑھا، اور ان کے بارے میں بعض لوگوں نے یہ بھی کہا ہے کہ وہ ہر دو روز میں ایک ختم قرآن مجید پڑھا کرتے تھے، امام ذہبی نے طبقات القراء میں اسے ذکر کیا ہے۔ (اعلام الاخبار فی طبقات فقهاء مذہب النعمان المختار لمحمود بن سلیمان الکفوی)

(۱۳) حضرت محمد بن واسع رحمہ اللہ

موسیٰ بن یسار کہتے ہیں کہ میں مکہ سے بصرہ تک حضرت محمد بن واسع کی صحبت میں رہا، وہ تمام رات نماز پڑھتے رہتے، اونٹ کی پشت پر محمل میں اشارہ سے نوافل پڑھا کرتے، کبھی رات کے اخیر حصے میں اونٹ سے اتر کر پڑاؤ ڈالتے اور نماز میں لگ جاتے، جب صبح ہوتی اپنے رفقاء کو ایک ایک کرکے نماز کے لئے بیدار کرتے۔ (حلیۃ الاولیاء صفحہ ۳۴۶ جلد ۲)

اس کے باوجود خوف وخشیت اور تواضع کا یہ عالم تھا کہ جب ان سے صبح کو پوچھا جاتا کہ کیا حال ہے، تو فرماتے قریباً اجلی بعیداً املی، مسیئا عملی، موت قریب ہے، امید بعید ہے، عمل برا ہے۔ (حلیۃ الاولیاء صفحہ ۳۴۶ جلد ۲)

(۱۴) حضرت مالک بن دینار رحمہ اللہ

حضرت مالک بن دینار کے داماد مغیرہ بن حبیب فرماتے ہیں کہ میں نے ایک بار مالک بن دینار کے ساتھ عشاء کی نماز پڑھی، پھر انہوں نے کچھ تناول فرمایا اس کے بعد نماز کے لئے کھڑے ہوگئے۔ نماز میں ثنا کے بعد انہوں نے

یہ دعا شروع کی اذا جمعت الاولین والآخرین فحرم شیبة مالك علی النار۔ اے اللہ آپ جب اولین وآخرین کو جمع کریں گے، تو مالک کے سفید بالوں کو آگ پر حرام کر دیجئے۔ انہوں نے اتنی دیر تک اس دعا کو دہرایا کہ مجھے نیند آنے لگی، پھر جب میری آنکھ کھلی تو وہ ابھی اسی کی تکرار کئے جارہے تھے، یہاں تک کہ صبح ہوگئی۔ (حلیة الاولیاء صفحہ۳۶۱ جلد۲)

(۱۵) حضرت سلیمان بن طرخان التیمی رحمہ اللہ

حضرت سلیمان تیمی نے بصرہ کی جامع مسجد میں چالیس سال تک امامت کی، وہ عشاء اور فجر کی نماز ایک ہی وضو سے ادا کرتے تھے۔ (حلیة الاولیاء ص ۲۹ ج ۳)

(۱۶) حضرت منصور بن زاذان رحمہ اللہ

ہشام بن حسان فرماتے ہیں کہ میں اور منصور دونوں نماز پڑھا کرتے تھے، جب رمضان شریف کا مہینہ آتا، تو وہ عشاء اور مغرب کے درمیان دو ختم پڑھتے، اور اسکے بعد عشاء کی جماعت کھڑی ہونے تک طٰسٓ (یعنی سورۂ نمل تک) پڑھ لیتے اس وقت لوگ رمضان شریف میں عشاء کی نماز چوتھائی رات گزرنے پر پڑھا کرتے تھے، انھیں ہشام بن حسان سے ایک دوسری سند سے منقول ہے، وہ فرماتے ہیں کہ میں نے منصور کے قریب مغرب وعشاء کے درمیان نوافل پڑھیں۔ اتنی دیر میں انھوں نے ایک ختم قرآن پڑھا اور مزید سورۂ نمل تک پڑھا۔

مخلد بن حسین فرماتے ہیں کہ ایک دن اور رات میں منصور پورا قرآن پڑھا کرتے ، علاء فرماتے ہیں کہ میں واصل کی مسجد میں آیا، مؤذن نے ظہر کی اذان دی منصور آئے ، اور انھوں نے نماز شروع کردی، جماعت ہونے تک میں نے دیکھا کہ گیارہ سجدۂ تلاوت انھوں نے کئے، (یعنی کم ازکم چوبیس پاروں کی انھوں نے تلاوت کی۔ (حلیۃ الاولیاء ص۵۷ ج۳)

(۱۷) حضرت علی بن عبداللہ بن عباس رحمہ اللہ

حافظ ابن حجر عسقلانی نے تہذیب التہذیب ص۳۵۸ ج۷ میں لکھا ہے، علی بن عبداللہ کا کثرت نماز کی وجہ سے سجّاد (بہت سجدہ کرنے والے) لقب ہوگیا تھا، علی بن ابی حملہ کہتے ہیں کہ علی بن عبداللہ ہرروز ایک ہزار سجدہ کرتے تھے، اور میمون بن زیاد عدوی فرماتے ہیں کہ ہرروز ایک ہزار رکعت نماز پڑھتے تھے۔

امام ذہبی نے العبر باخبار من غبر ص۱۴۸ ج۱ میں لکھا ہے کہ امام اوزاعی نے فرمایا ہے کہ وہ ہرروز ایک ہزار سجدے کیا کرتے تھے، یہی بات حلیۃ الاولیاء ص۲۰۷ ج۳ میں بھی علی بن ابی حملہ اور امام اوزاعی سے منقول ہے۔ اور اس میں ایک ہزار سجدہ کی شرح پانچ سو رکعت سے کی گئی ہے۔

ایک روایت میں ہرروز ایک ہزار رکعت کا ذکر ہے، اور باقی روایات میں پانچ سو رکعت مفہوم ہوتی ہے، ممکن ہے احوال یا عمر کے فرق کی وجہ سے یہ تفاوت واقع ہو، یعنی کسی وقت میں روزانہ پانچ سو رکعت پڑھتے رہے ہوں، جنھوں نے اسے دیکھا، ویسا نقل کیا، اور بعض حالات میں ایک ہزار رکعت کا

معمول رہا ہو۔ جنھوں نے وہ دیکھا اسے نقل کیا۔

(۱۸) امام ابو حنیفہ علیہ الرحمۃ

امام صاحب کی کثرت عبادت اور اس سلسلے میں ان کی جانفشانی کو معتبر حضرات کی ایک جماعت نے نقل کیا ہے، شمس الائمہ محمد عبد الستار الکردری نے اپنی کتاب (مناقب الامام ابی حنیفه) ص ۲۴۱ ج ا میں لکھا ہے کہ امام صاحب کے سلسلے میں منقول ہے کہ انھوں نے تیس سال سے زیادہ مدت تک فجر کی نماز عشاء کے وضو سے پڑھی ہے، اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ چالیس سال یہ عمل رہا ہے، ہر روز ایک ختم قرآن پڑھتے تھے، اور رمضان شریف میں دو ختم، ایک ختم دن میں، اور ایک ختم رات میں، حضرت عبد اللہ بن مبارک فرماتے ہیں کہ امام ابو حنیفہؒ دو رکعت میں ایک ختم پڑھ لیتے تھے، انھوں نے یہ بھی فرمایا ہے کہ چار ائمہ نے دو رکعت میں قرآن مکمل پڑھا ہے۔

۱۔ حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ
۲۔ حضرت تمیم داری رضی اللہ عنہ
۳۔ حضرت سعید بن جبیر علیہ الرحمۃ
۴۔ امام ابو حنیفہ علیہ الرحمۃ

امام نووی نے تهذيب الاسماء واللغات ص ۲۲۰ ج ۲ میں لکھا ہے کہ ابراھیم بن عکرمہ کہتے ہیں کہ میں نے امام ابو حنیفہ سے بڑھ کر متورع اور فقیہ نہیں دیکھا، سفیان بن عیینہ فرماتے ہیں کہ ہمارے دور میں امام ابو حنیفہ سے زیادہ نماز پڑھنے والا مکہ مکرمہ میں کوئی نہیں آیا۔ یحییٰ بن ایوب زاہد کہتے ہیں کہ

امام ابو حنیفہ رات میں بالکل نہیں سوتے تھے ابو عاصم نبیل کہتے ہیں کہ امام ابو حنیفہ اتنی کثرت سے (اور اتنی طویل) نماز پڑھتے تھے کہ لوگ انھیں "وتد" (کھونٹا) کہنے لگ گئے تھے۔ اسد بن عمرو کہتے ہیں کہ امام ابو حنیفہ نے عشاء کے وضو سے فجر کی نماز چالیس سال تک پڑھی ہے۔ اور عام طور سے رات میں ایک رکعت میں پورا قرآن پڑھ لیتے تھے، ان کے رونے کی آواز ان کے پڑوسی سنا کرتے تھے، انھیں ان پر ترس آیا کرتا تھا، جس جگہ ان کی وفات ہوئی ہے وہاں انھوں نے سات ہزار ختم قرآن پاک پڑھے ہیں۔

حسن بن عمارہ سے منقول ہے کہ انھوں نے وفات کے بعد امام ابو حنیفہؒ کو غسل دیا تھا، اس وقت انھوں نے کہا کہ اللہ تعالیٰ آپ کی مغفرت فرمائے، تیس سال تک آپ نے روزہ کا ناغہ نہیں کیا، اور چالیس سال تک رات میں اپنے پہلو کو تکئے سے جدا رکھا حضرت عبداللہ بن مبارک سے تو یہاں تک منقول ہے کہ ۴۵ سال تک ایک وضو سے پانچوں نمازیں پڑھتے رہے ہیں۔ اور دو رکعت میں ایک ختم قرآن پاک پڑھتے تھے۔

امام ابو یوسفؒ فرماتے ہیں کہ میں امام ابو حنیفہؒ کے ساتھ چل رہا تھا، کسی نے کہا کہ یہ ابو حنیفہؒ ہیں، یہ رات بھر نہیں سوتے، امام صاحب نے فرمایا کہ میرے متعلق ایسی بات نہیں کہی جائے گی، جو میں نہ کرتا ہوں، پھر وہ پوری رات نماز و دعا اور تضرع وزاری میں گزارنے لگے۔

حضرت مسعر بن کدام فرماتے ہیں کہ میں ایک رات مسجد میں داخل ہوا، میں نے ایک آدمی کو نماز پڑھتے ہوئے دیکھا، اسکے قرآن پڑھنے میں مجھے بڑی

حلاوت محسوس ہوئی۔ انھوں نے پورے قرآن کا ساتواں حصہ پڑھا، میں نے سوچا کہ اب رکوع کریں گے، پھر ایک تہائی تک پڑھ گئے، پھر آدھا پڑھ لیا، پھر پڑھتے ہی چلے گئے، حتّٰی کہ ایک رکعت میں پورا قرآن پڑھ لیا یہ امام ابوحنیفہ تھے، حضرت زائدہ فرماتے ہیں کہ میں نے امام صاحب کے ساتھ انکی مسجد میں عشاء کی نماز پڑھی لوگ پڑھ کر چلے گئے، اور مسجد میں کوئی نہیں بچا، میں نے ارادہ کیا کہ امام صاحب سے ایک مسئلہ دریافت کروں، مگر انہوں نے کھڑے ہوکر نماز شروع کردی، جب اس آیت پر پہنچے، فَمَنَّ اللّٰهُ عَلَيْنَا وَوَقَانَا عَذَابَ السَّمُوْمِ ۝ (سورۃ الطور ۲۷) تو اسے دہراتے رہے، یہاں تک صبح کی اذان ہونے لگی، اور میں انتظار کرتا ہی رہ گیا قاسم بن معن کہتے ہیں کہ امام ابوحنیفہؒ نے نماز میں بَلِ السَّاعَةُ مَوْعِدُهُمْ وَالسَّاعَةُ اَدْهٰى وَاَمَرُّ ۝ (سورۃ القمر ۴۶) پڑھی اور رات بھر اسے پڑھتے رہے اور روتے رہے مکی بن ابراہیم کہتے ہیں کہ میں اہل کوفہ کے ساتھ رہا ہوں، میں نے امام ابوحنیفہؒ سے زیادہ کسی کو متقی اور محتاط نہیں دیکھا۔

علامہ یافعی نے بھی مرأۃ الجنان میں امام ابویوسف کی وہ روایت نقل کی ہے، جس کا ذکر اوپر آیا۔ (مرأۃ الجنان ص۳۱۰ ج۱)

شیخ عبدالوہاب شعرانی نے المیزان الکبریٰ میں لکھا ہے کہ امام ابوجعفر نے اپنی سند سے ابراہیم بن عکرمہ مخزومی سے نقل کیا ہے کہ میں نے اپنے زمانہ میں امام ابوحنیفہ سے بڑھ کر عابد و زاہد، متقی اور عالم نہیں دیکھا اور ابونعیم وغیرہ نے نقل کیا ہے کہ انھوں نے عشاء کے وضو سے فجر کی نماز

پچاس سال سے زائد پڑھی ہے، اور رات میں کبھی بستر پر پہلو نہیں رکھتے تھے، صرف ظہر کے بعد تھوڑی دیر بیٹھے بیٹھے سو رہتے تھے، اور فرماتے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ دوپہر کو سو کر قیام اللیل میں مدد حاصل کرو۔

ملا علی قاری نے "الاثمار الجنیه فی طبقات الحنفیه" میں امام زفر سے نقل کیا ہے کہ میرے پاس امام ابوحنیفہ نے ایک رات قیام فرمایا، پوری رات ایک ہی آیت پڑھتے رہے۔ بَلِ السَّاعَةُ مَوْعِدُهُمْ وَالسَّاعَةُ أَدْهٰى وَأَمَرُّ ۝، اور یہ بھی مروی ہے ایک مرتبہ رات بھر "فَمَنَّ اللّٰهُ عَلَيْنَا وَوَقَانَا عَذَابَ السَّمُوْمِ ۝" پڑھتے رہے۔

یہ بھی مروی ہے کہ ایک روز عشاء کی نماز میں امام نے سورۂ زلزال پڑھی، امام صاحب پیچھے تھے، امام صاحب لوگوں کے چلے جانے کے بعد مسجد میں ہی رہے، اور صبح تک اپنی ڈاڑھی پکڑے ہوئے کہتے رہے، اے وہ ذات جو ذرہ بھر بھلائی کا بدلہ بھلائی سے دیگی، اور ذرہ بھر برائی کا بدلہ برائی سے دیگی، اپنے بندے نعمان کو آگ سے پناہ دیجئے۔

حفص بن عبد الرحمٰن کہتے ہیں کہ امام صاحب تیس سال تک ہر رات میں قرآن ایک رکعت میں ختم کرتے تھے۔

شیخ ابن حجر ہیتمی نے اپنی کتاب معدن الیواقیت الملتمعه فی مناقب الائمة الاربعة میں لکھا ہے کہ شیخ عطار نے تذکرہ میں لکھا ہے کہ امام ابوحنیفہ ہر رات میں تین سو رکعت نماز پڑھتے تھے، ایک روز چند بچوں کے پاس سے گزرے تو وہ آپس میں کہنے لگے کہ یہ ہر رات ایک ہزار رکعت نماز پڑھتے ہیں اور رات

میں بالکل نہیں سوتے امام صاحب نے فرمایا اب میرا ارادہ یہی ہے کہ ہر رات ایک ہزار رکعت پڑھوں، اور رات میں بالکل نہ سوؤں۔

اور مسعر بن کدام (جو کہ زہد و عبادت میں معروف ہیں۔) نے فرمایا کہ میں امام ابو حنیفہ کی مجلس میں حاضر ہوا۔ میں نے دیکھا کہ وہ فجر کی نماز پڑھ رہے ہیں۔ پھر لوگوں کے ساتھ تعلیم علم کے لئے بیٹھ گئے، اور ظہر تک بیٹھے رہے، اس کے بعد پھر بیٹھے تو عصر تک مجلس رہی۔ عصر کے بعد پھر مغرب تک درس وافادہ کا سلسلہ رہا، مغرب کے بعد عشاء تک پھر یہی حلقہ رہا۔ میں نے اپنے دل میں سوچا کہ یہ شخص جب اسی مشغولیت میں دن بھر رہ گیا تو عبادت کا وقت کب نکالتا ہوگا۔ اچھا اب رات کو دیکھتا ہوں کہ یہ کیا کرتے ہیں، جب لوگ عشاء پڑھ کر چلے گئے، تو یہ نماز کے لئے کھڑے ہو گئے، اور پوری رات نماز پڑھتے رہے۔

مولانا عبد الحی لکھنوی فرماتے ہیں کہ امام صاحب کے متعلق جتنا کچھ یہاں ہم نے نقل کیا ہے، اسی کی طرح باتیں، بلکہ اس سے بھی زیادہ دوسرے علماء نے بھی اپنی کتابوں میں لکھی ہیں، چنانچہ صاحب ہدایہ نے مختارات النوازل میں، امام ذہبی نے العبر باخبار من غبر میں، محمود بن سلیمان الکفوی نے اعلام الاخیار فی طبقات فقهاء مذهب النعمان المختار میں امام سیوطی نے تبییض الصحیفة بمناقب الامام ابی حنیفه میں، ابن خلکان نے وفیات الاعیان میں، اور دوسرے متقدمین و متاخرین نے اس کثرت سے امام صاحب کے متعلق واقعات وروایات نقل کئے ہیں، جو تواتر

معنوی کی حد تک پہنچ گئے ہیں جس نے ان کتابوں کا مطالعہ کیا ہوگا۔ اسے تواتر میں ذرا بھی تردد نہ ہوگا۔

عہد تابعین کے بعد عابدین وزاہدین

(۱) حضرت سعد بن ابراہیمؒ (م ۱۲۷ھ)

یہ حضرت عبد الرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ کے پوتے ہیں، ان کے متعلق صاحب حلیۃ الاولیاء نے ان کے بیٹے ابراہیم کے حوالے سے نقل کیا ہے کہ رمضان کی اکیسویں، پچیسویں اور ستائیسویں تاریخ کو افطار سے پہلے ختم قرآن کر لیتے تھے۔ (ص ۱۷۰ ج ۳)

حضرت شعبہ فرماتے ہیں کہ وہ ہمیشہ روزہ رکھتے اور روزانہ ایک ختم قرآن پڑھتے العبر ص ۱۶۵ ج ۱ و مرأۃ الجنان ص ۲۶۹ ج ۱

(۲) حضرت ابراہیم بن ادہمؒ (م ۱۶۲ھ)

یہ مشہور بزرگ ہیں، جنھوں نے سلطنت چھوڑ کر زہد وفقر اختیار کیا تھا، ابونعیم نے حلیۃ الاولیاء میں ابو اسحاق فزاری کے حوالے سے لکھا ہے کہ ابراہیم ایک سال رمضان شریف میں دن میں کھیتی کاٹتے تھے۔ اور رات بھر نمازیں پڑھتے تھے، تیس دن ان کے ایسے گزرتے کہ نہ دن میں سوتے نہ رات میں۔

(۳) حضرت شعبہ بن الحجاجؒ (م ۱۶۰ھ)

مشہور امام حدیث ہیں عمر بن ہارون فرماتے ہیں کہ شعبہ صائم الدہر تھے حضرت سفیان ثوری ہر ماہ تین تین دن روزہ رکھتے تھے۔ (حلیۃ الاولیاء ص ۱۴۵ ج ۷)

اور امام ذہبی نے العبر ص ۲۳۵ ج ۱ میں لکھا ہے کہ ابوزید ہروی فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت شعبہ کو نماز پڑھتے ہوئے دیکھا، ان کے قدم ورم آلود ہو گئے تھے۔

(۴) حضرت فتح بن سعید موصلیؒ

ابراہیم بن عبداللہ کا بیان ہے کہ حضرت فتح موصلی کے سر میں درد ہوا، تو وہ بہت خوش ہوئے، اور بارگاہ الٰہی میں عرض کیا کہ یا اللہ! آپ نے مجھے وہ بیماری دی جو انبیاء کی بیماری ہے، اس کا شکریہ ہے کہ میں آج رات چار سو رکعت نماز پڑھوں۔ (حلیۃ الاولیاء ص ۲۹۲ ج ۷)۔

(۵) امام شافعیؒ (م ۲۰۴)

امام شافعی علیہ الرحمۃ کے مشہور شاگرد ربیع بن سلیمان فرماتے ہیں کہ امام صاحب رمضان کے مہینے میں ساٹھ قرآن پاک پڑھتے تھے، اور تمام تر ختم صرف نماز میں ہوتا تھا۔ اور فرماتے ہیں کہ یہ بات میں نے خود امام شافعی علیہ الرحمۃ سے سنی ہے (حلیۃ الاولیاء ص ۱۳۴ ج ۹)۔

اور امام نووی نے تہذیب الاسماء واللغات میں ربیع کا قول نقل کیا ہے کہ میں امام شافعیؒ کے گھر متعدد بار رہا ہوں، وہ رات کو بہت کم سوتے تھے، امام حمیدی فرماتے ہیں کہ امام صاحب ہر روز ایک ختم قرآن پڑھتے تھے۔

(۶) حضرت امام احمد بن حنبلؒ

امام صاحب کے صاحبزادے عبداللہ بن احمد فرماتے ہیں کہ میرے والد

ہر روز تین سو رکعت نماز پڑھا کرتے تھے، جب کوڑوں کی ضرب شدید نے انہیں بیمار ڈال دیا اور وہ کمزور ہو گئے تو ہر روز ڈیڑھ سو رکعت پڑھنے لگے، اس وقت ان کی عمر اسی (۸۰) سال کے قریب تھی۔ (حلیۃ الاولیاء ص ۱۸۱ج۹)

شیخ عبد الفتاح ابو غدہ لکھتے ہیں کہ:

> ''امام ابن جوزی نے مناقب الامام احمد میں لکھا ہے کہ امام صاحب ہر روز قرآن کی ایک منزل پڑھتے، اور سات روز میں ختم کرتے، اور دن کی نماز کے علاوہ ہر سات رات میں بھی ایک ختم پڑھتے، عشاء کی نماز ادا کر کے ہلکی نیند سوتے، پھر صبح تک نماز میں مشغول رہتے (ص ۲۸۶)

(۷) حضرت ابو العباس احمد بن محمد بن سہل بن عطاء

حافظ ابو نعیم ابو الحسین محمد بن علی کا قول نقل کرتے ہیں کہ میں کئی سال تک حضرت ابو العباس بن عطاء کی صحبت میں رہا کہ ان کے آداب سیکھوں، وہ ہر روز ایک ختم پڑھتے تھے، اور رمضان کے مہینے میں ہر رات دن میں تین ختم قرآن پڑھتے تھے (حلیۃ الاولیاء ص ۳۰۲ ج ۱۰)

(۸) حضرت منصور ابو عتاب السلمی الحافظ (م ۱۳۲ھ)

حافظ ذہبی کے العبر میں لکھا ہے کہ انہوں نے چالیس سال تک روزہ رکھا، اور پوری رات گریہ وزاری میں گزارتے تھے۔ (ص ۱۷۷)

(۹) حضرت واصل بن عبد الرحمٰن البصریؒ (م ۱۵۲ھ)

امام ذہبی نے حافظ ابو داؤد طیاسی کا قول نقل کیا ہے کہ واصل بن عبد الرحمٰن ہر رات میں ایک ختم قرآن پڑھتے تھے۔

(۱۰) محمد بن عبد الرحمٰن ابو الحارث فقیہ (م ۱۵۹)

یہ حضرت نافع اور عکرمہ کے شاگرد ہیں امام ذہبی اور امام یافعی نے سنہ ۱۵۹ھ کے ذیل میں تحریر کیا ہے کہ واقدی کہتے ہیں کہ وہ پوری رات عبادت کرتے تھے۔ اور عبادت میں بہت کاوش کرتے تھے۔

(۱۱) حضرت وکیع بن جراحؒ

کوفہ کے مشہور محدث ہیں، امام ابو حنیفہؒ کے شاگرد ہیں اور امام احمد بن حنبل کے استاذ کفوی نے اعلام الاخیار میں یحییٰ بن اکثم کا قول نقل کیا ہے، وہ فرماتے ہیں کہ میں ان کی خدمت میں سفر اور حضر دونوں میں رہا ہوں، وہ ہمیشہ روزہ رکھتے تھے، اور ہر رات میں ایک قرآن پڑھتے تھے، اور محمد بن جزیر سے منقول ہے کہ وکیع نے عباد ان میں چالیس رات قیام کیا، اور چالیس مرتبہ قرآن ختم کیا، اور چالیس ہزار درہم صدقہ کیا۔

صحابہ وتابعین

یہاں تک تو حضرت مولانا عبد الحئ صاحب فرنگی محلیؒ نے جمع کیا، علماء و محدثین اور مشائخ کی اتنی بڑی تعداد کے ذکر کے بعد مزید کچھ اور تلاش وجستجو

کی ضرورت نہیں ہے لیکن یہ ذکر اتنا لذیذ اور ایمان افروز ہے کہ بس کہتے رہیئے، اللہ کی عبادت، اس کے کلام کی تلاوت اور اس کے ذکر کی کثرت سے بڑھ کر اور کس چیز میں حلاوت ولذت ہو سکتی ہے شیخ عبدالفتاح ابو غدہ، جنہوں نے مولانا عبدالحئ صاحب کی کتاب اقامۃ الحجۃ کی تحقیق وتعلیق کا فرض انجام دیا ہے، یہاں تک جب وہ پہنچے تو ذوق عبادت کی لذت نے انہیں مجبور کیا کہ کتاب کی تحقیق کے دوران کچھ اور بزرگوں کے واقعات اس موضوع پر جو اُن کے سامنے آئے۔ انہیں بھی شامل تعلیقات کر دیں، شاید کسی کو اس سے اجر وثواب کی رغبت پیدا ہو، ممکن ہے سالکین کو مزید نشاط پیدا ہو، اور ان کی مبارک اوقات کی نیک دعاؤں میں ان کی بھی شمولیت ہو جائے۔ مناسب ہے کہ یہ خاکسار مرتب بھی گرد کارواں بنا رہے۔

(۱) حضرت سلیم بن عتر التجیبی تابعیؒ م ۷۵ھ

حافظ ابن کثیر نے البدایہ والنہایہ صفحہ ۱۱۸ جلد ۹ میں حجاج کے تذکرہ کے دوران ابن عساکر کے حوالے سے لکھا ہے کہ سلیم بن عتر قاضی مصر اکابر تابعین میں تھے، زہد وعبادت میں ان کا بڑا مقام تھا۔ ہر رات نماز وغیرہ میں تین مرتبہ ختم قرآن کرتے تھے۔

(۲) حضرت مسعر بن کدام ہلالیؒ م ۱۵۵ھ

کوفہ کے اکابر محدثین میں ہیں، حافظ ابن حجر نے تہذیب التہذیب صفحہ ۱۱۵ جلد ۱۰ میں ان کے بیٹے محمد کا قول نقل کیا ہے کہ میرے والد جب تک آدھا قرآن پڑھ نہ لیتے، رات میں نہ سوتے۔

(۳) حضرت حسن بن صالح الثوری ۱۶۹ھ

امام ابوالحسن عجلی نے اپنی کتاب معرفۃ الثقات میں اور حافظ ابن حجر نے تہذیب التہذیب صفحہ ۲۸۸ جلد ۲ میں حضرت وکیع کا ارشاد نقل کیا ہے کہ حسن بن صالح اور علی بن صالح اور ان کی ماں تینوں نے رات کے تین حصے کر رکھے تھے، اور ہر رات گھر میں ایک ختم قرآن پڑھتے تھے، ہر ایک کے حصے میں رات کا تہائی حصہ آتا تھا، جب ان کی ماں کا انتقال ہوگیا تو انہوں نے اپنے حصوں میں اضافہ کرلیا۔ اور دونوں مل کر ایک ختم کرنے لگے، پھر علی کا انتقال ہوگیا، تو اب حسن نے دونوں کا حصہ سنبھال لیا۔ اور تن تنہا ہر روز ایک ختم پڑھنے لگے۔ حضرت ابوسلیمان دارانی فرماتے ہیں کہ خوف الٰہی کے جتنے آثار میں نے حسن کے چہرے پر دیکھے ہیں، اتنے کسی اور پر نہیں دیکھے، ایک روز نماز میں سورۂ عَمَّ یَتَسَآءَلُوْنَ پڑھ رہے تھے کہ ان پر ایک اثر طاری ہوگیا، اور بے ہوشی کی سی کیفیت ہوگئی۔ رات بھر میں اسے اس روز نہیں پڑھ سکے۔

(۴) امام ابومحمد عبداللہ بن ادریس الاودی الکوفی ۱۹۲ھ

امام نووی نے شرح مسلم میں لکھا ہے کہ ان کی امامت وعظمت ان کے اتقان وفضیلت اور ان کے ورع وعبادت پر سب کا اتفاق ہے۔ جب ان کا انتقال ہونے لگا، تو ان کی صاحبزادی رو پڑیں۔ انہوں نے فرمایا۔ مت روؤ، اس گھر میں میں نے چار ہزار ختم قرآن پڑھے ہیں۔ حضرت امام احمد بن حنبل فرماتے ہیں کہ ابن ادریس یکتائے زمانہ تھے۔

(۵) امام ابوبکر بن عیاش ۱۹۳ھ

امام نووی نے شرح مسلم میں لکھا ہے کہ حضرت ابوبکر امام ہیں، ان کے فضل وکمال پر سب کا اجماع ہے، ان کے بیٹے ابراہیم فرماتے ہیں کہ مجھ سے میرے والد نے فرمایا کہ تمہارے باپ نے کبھی کوئی بے حیائی کا کام نہیں کیا۔ انہوں نے تیس سال تک ہر روز ایک قرآن ختم کیا ہے۔ انہوں نے اپنے بیٹے سے یہ بھی فرمایا کہ بیٹے! خبر دار اس حجرے میں کبھی اللہ کی نافرمانی نہ کرنا۔ اس لئے کہ میں نے اس میں بارہ ہزار مرتبہ قرآن کریم ختم کیا ہے۔ ان کے انتقال کے وقت ان کی بیٹی رونے لگیں تو فرمایا کہ اے بیٹی! نہ رو، کیا تو سمجھتی ہے کہ اللہ تعالیٰ مجھے عذاب دیں گے۔ میں نے اس مکان میں ۲۴؍ ہزار ختم قرآن پڑھا ہے۔

حافظ ابن حجر نے تہذیب التہذیب صفحہ ۳۶ جلد ۱۲ میں ان کے تذکرہ میں لکھا ہے کہ ان کی ولادت ۹۵ھ یا ۹۶ھ میں ہوئی اور وفات ۱۹۳ھ میں ہوئی، انہوں نے ستر سال تک روزہ رکھا، اور شب بیداری فرمائی، ان کے بارے میں رات کی نیند سے کوئی واقف نہیں۔

(۶) ابو بشر احمد بن محمد بن حسنویہ نیساپوری ۳۹۰ھ

(علامہ ابن اثیر نے لباب صفحہ ۳۰۰ جلد ۱ میں ان کا ذکر کیا ہے، لکھتے ہیں کہ وہ امام محمد بن اسحاق بن خزیمہ کے شاگرد ہیں، ہر رات ایک ختم قرآن پڑھتے تھے۔

(۷) جعفر بن حسن درزیجانی ۵۰۶ھ

حافظ ابن رجب نے ذیل طبقات الحنابلہ صفحہ ۱۱۰ جلد ۱ میں لکھا ہے کہ وہ اللہ کے صالح بندوں میں تھے، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ان کی امتیازی شان تھی، اس سلسلے میں ان کے کارنامے معروف ہیں۔ ہمیشہ روزہ رکھتے تہجد پڑھتے اور شب بیداری کرتے انہوں نے بے شمار مرتبہ قرآن ختم کیا ہے، اور ہر ختم ایک رکعت میں پڑھا ہے، نماز کے سجدہ میں ان کا وصال ہوا۔

امام نووی کا ارشاد

امام نووی نے التبیان فی آداب حملۃ القرآن صفحہ ۱۱، ۱۲ میں اور الاذکار صفحہ ۹۵، ۹۶ میں تحریر فرمایا ہے کہ ''حافظ قرآن کو چاہیئے کہ اس کی تلاوت کا اہتمام کرے، اور رات و دن میں اسے بکثرت پڑھتا رہے، خواہ سفر ہو یا حضر، حضرات سلف رحمہم اللہ کے دستور ختم قرآن کے سلسلے میں مختلف رہے ہیں، بعض حضرات ہر ماہ میں ایک ختم پڑھتے، بعض بزرگ ہر دس رات میں، بعض لوگ ہر آٹھ رات میں، بعض اکابر ہر سات رات میں، اور یہ عمل اکثر سلف کا رہا ہے، بعض حضرات چھ رات میں قرآن ختم کرتے، بعض پانچ رات میں، کچھ لوگ چار رات میں، اور بہت سے لوگ صرف تین رات میں پڑھتے اور ایسے بھی بہت ہوئے ہیں جو ایک دن ایک رات میں پورا قرآن پڑھتے، ایک جماعت ایسی بھی رہی ہے جو رات دن میں دو ختم پڑھتی، اور کچھ اصحاب تین ختم پڑھتے، بعض حضرات دن رات میں آٹھ ختم بھی کرتے، چار دن میں،

اور چار رات میں، ہماری واقفیت میں ختم کی یہی سب سے بڑی مقدار آئی ہے۔

رات دن میں آٹھ ختم پڑھنے والوں میں ایک بزرگ سید جلیل ابن الکاتب الصوفی رحمۃ اللہ علیہ ہیں اور یہ سب سے بڑی مقدار ہے، جو ہماری واقفیت میں آئی۔

سید جلیل احمد بن دورتی نے اپنی سند سے منصور بن زاذان کے متعلق (جو بڑے عبادت گزار تابعی ہیں) نقل کیا ہے کہ وہ ظہر وعصر کے درمیان مکمل قرآن پڑھ لیتے تھے۔ اسی طرح مغرب وعشاء کے درمیان بھی ایک ختم پڑھ لیتے۔ اور رمضان شریف میں مغرب وعشاء کے درمیان دو ختم سے کچھ زائد پڑھ لیتے تھے۔ ابن ابی داؤد نے صحیح سند سے نقل کیا ہے کہ حضرت مجاہد رمضان شریف میں مغرب وعشاء کے درمیان پورا قرآن پڑھ لیا کرتے تھے۔

اور جن اکابر نے ایک رکعت یا ایک رات اور دن میں قرآن ختم کیا ہے وہ تو بے شمار ہیں۔ چند حضرات کے نام یہ ہیں، حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ، حضرت تمیم داری رضی اللہ عنہ، حضرت سعید بن جبیر اِن حضرات نے مسجد حرام میں ایک ایک رکعت میں پورا قرآن پڑھا ہے، حضرت مجاہد، امام شافعی، اور دوسرے اکابر جنہوں نے ایک رات اور دن میں قرآن ختم کیا ہے۔ منصور سے روایت ہے کہ علی ازدی، رمضان کی ہر رات میں مغرب اور عشاء کے درمیان ایک ختم پڑھ لیا کرتے تھے اور ابراہیم بن سعد فرماتے ہیں کہ میرے والد بیٹھ کر اپنے پاؤں اور کمر پر رومال باندھ لیتے، اور اس وقت تک نہ کھولتے جب تک پورا ختم قرآن نہ ہو جاتا۔

اور جن لوگوں نے روزانہ تین ختم پڑھے ہیں ان میں ایک بزرگ مسلم بن عتر رضی اللہ عنہ ہیں، جو حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے عہد میں مصر کے قاضی تھے، بلکہ ابن ابی داؤد نے تو اُن کے متعلق یہ روایت نقل کی ہے کہ وہ روزانہ چار ختم قرآن پڑھتے تھے اور یہی بات ابو عمر کندی نے بھی اپنی کتاب قضاۃ مصر میں بھی لکھی ہے، کہ وہ روزانہ چار ختم پڑھا کرتے تھے۔

اور جن لوگوں نے ایک ہفتہ میں قرآن ختم کیا ہے، وہ تو بہت ہیں۔ حضرت عثمان بن عفان حضرت عبداللہ بن مسعود، حضرت زید بن ثابت، حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہم کے متعلق یہی بات منقول ہے، ان کے علاوہ تابعین میں عبدالرحمٰن بن زید، علقمہ، اور ابراہیم نخعی رحمہم اللہ کے سلسلے میں بھی یہی منقول ہے کہ ایک ہفتہ میں قرآن کی تلاوت مکمل کرتے تھے۔

اب تک جو لکھا گیا ہے، اس سے اندازہ کرنے والے اندازہ کر سکتے ہیں کہ کثرت عبادت کوئی نئی چیز نہیں ہے عہد نبوت سے لے کر اب تک ہر دور میں، امت نے انہیں بزرگوں کو اپنا پیشوا اور مقتدا تسلیم کیا ہے، جو عوام وخواص میں کثرت عبادت میں یا علم میں ممتاز رہے ہیں، اور جس بات کا رواج وشیوع عہد نبوت میں رہا ہو، اور جس کی افضلیت واہمیت پر امت کا اجماع رہا ہو، اسے بدعت کہنے کی غلطی وہی کر سکتا ہے، جس کو سنت وبدعت کی خبر ہی نہ ہو۔

تاہم مضمون سابق چونکہ ہمارے اس دور میں ایک مستبعد چیز بن گیا ہے، دنیا داری کے غلبہ اور دینداری سے بعد کی وجہ سے طبیعتیں اس سے مانوس نہیں

رہ گئی ہیں اور نہ عام طور سے اس کا مشاہدہ ہوتا ہے۔ اس لئے پڑھنے والوں کے دماغ میں مختلف قسم کے شکوک وشبہات پیدا ہوتے ہیں۔ اس لئے مناسب ہے کہ ان شبہات پر مفصل گفتگو کرلی جائے، شاید کچھ بند دلوں کے تالے کھل جائیں۔ یہ شبہات مختلف راہوں سے اور الگ الگ عنوانات سے پیش کئے جاتے ہیں۔ لیکن اگر ہم ان کا خلاصہ معلوم کرنا چاہیں تو تین اشکالات میں ان کا دائرہ سمٹ کر آجاتا ہے۔

پہلا اشکال:

یہ جتنے واقعات وحکایات لکھے گئے، سب بغیر سند کے لکھے گئے۔ حالانکہ اس طرح کے واقعات کو جاننے کے لئے یا تو مشاہدہ ہونا ضروری ہے، یا سند متصل، اور یہاں دونوں میں سے ایک بھی نہیں، اس لئے ان پر اعتبار کرنے کی گنجائش نہیں ہے۔

دوسرا اشکال:

ان میں سے بیشتر واقعات عقلاً یا عادۃً محال معلوم ہوتے ہیں، مثلاً آدمی قرآن خواہ وہ کتنی ہی تیزی سے پڑھے، اگر وہ صاف صاف پڑھنا چاہے گا تو عموماً اسے ایک پارہ پڑھنے میں ۱۵/ سے ۲۰/ منٹ تک لگیں گے، اس سے کم میں پڑھنا چاہے گا، تو نہ حروف کی ادائیگی ہوگی، اور نہ صاف پڑھ سکے گا، اور حدیث کی رو سے اتنی تیزی سے پڑھنا ممنوع ہے کہ حروف کا پتہ ہی نہ چلے، اب کوئی حساب لگالے کہ پندرہ منٹ کے حساب سے کسی نے قرآن پڑھا تو

اسے پورا قرآن پڑھنے میں ساڑھے سات گھنٹے چاہئیں اور آٹھ ختم کرنے کے لئے ساٹھ گھنٹے درکار ہیں، پھر کیسے ممکن ہے کہ ۲۴ گھنٹے میں کوئی آٹھ ختم کرے۔ یہ اشکال کم وبیش اکثر واقعات پر وارد ہوتا ہے اس لئے معلوم ہوتا ہے کہ ان نقول وحکایات میں مبالغہ اور رنگ آمیزی کا اچھا خاصا دخل ہے۔

تیسرا اشکال:

تیسرا اشکال یہ ہے کہ بکثرت احادیث میں کثرت عبادت سے منع کیا گیا ہے، چنانچہ اس مضمون کی احادیث آئندہ بالتفصیل عرض کی جائیں گی، مذکورہ بالا عبادت کے واقعات وحالات، ان احادیث کے صراحۃً خلاف ہیں۔ اب یا تو یہ کہا جائے کہ یہ اکابر علماء خلاف سنت عمل کے مرتکب تھے، یا یہ مذکورہ واقعات ہی غلط ہوں۔ ہمارے زمانے میں دونوں طرح کے لوگ ہیں، بعض وہ بھی ہیں جو بزرگوں کے ان واقعات وحکایات کو صحیح سمجھتے ہیں لیکن ان کے اس عمل کو خلاف سنت اور بدعت سمجھتے ہیں، اور کچھ وہ بھی ہیں جو اُن بزرگوں کا احترام کرتے ہیں۔ اور انہیں ائمہ ہدایت سمجھتے ہیں، لیکن ان واقعات کی صحت میں تامل کرتے ہیں۔

پہلے اشکال کا جواب

حضرت مولانا عبدالحئی صاحب فرنگی محلیؒ نے اس کا جواب یہ دیا ہے کہ ہم نے حلیۃ الاولیاء سے جو واقعات نقل کئے ہیں، ان کی سندیں متصل اور مسلسل ہم نے نقل کی ہیں۔ لہذا ان کو بے سند کہنا صحیح نہیں ہے۔ راقم الحروف

عرض کرتا ہے کہ میں نے اردو خوانوں کی رعایت میں سندیں نہیں نقل کی ہیں۔ لیکن حوالہ مکمل دے دیا ہے، جن کو اشکال ہو مولانا فرنگی محلیؒ کی کتاب اقامۃ الحجۃ یا اصل کتاب حلیۃ الاولیاء کی جانب رجوع کریں۔

اور جہاں بغیر سند کے واقعات ذکر کئے گئے ہیں، وہاں دیکھنا چاہیئے کہ ان واقعات و حکایات کے نقل کرنے والے کون لوگ ہیں؟ کیا وہ امت کے عام اشخاص وافراد ہیں، جن کی باتوں کا کوئی خاص وزن نہیں ہوتا۔ یا ایسے لوگ ہیں جو اس امت کے معتمد ترین علماء ومشائخ ہیں۔ آپ گزشتہ اوراق پلٹ کر دیکھئے کہ کن کن بزرگوں کا نام بطور حوالے کے آیا ہوا ہے، حافظ ابونعیم اصفہانی، عبدالکریم سمعانی، علامہ ابن کثیر دمشقی حافظ ابوسعد علامہ ابن حجر مکی، حافظ ابن حجر عسقلانی، حافظ جلال الدین سیوطی، ملا علی قاری، شمس الائمہ کردری، امام نووی، شیخ عبدالواہاب شعرانی، شیخ الاسلام علامہ ذہبی وغیرہ۔

کیا ان میں سے کسی پر انگلی رکھی جاسکتی ہے، یہ وہ علماء وائمہ ہیں، جو نقل وحکایت میں مستند ترین ہیں یہ ائمہ اسلام ہیں، مرجع انام ہیں، اہم مسائل میں ان کے اقوال کی جانب رجوع کیا جاتا ہے، اور ان کی بیان کردہ حکایات کو قطعیات کا درجہ دیا جاتا ہے۔

کیا کوئی سوچ سکتا ہے کہ ان حضرات نے اپنی تصانیف میں جھوٹی حکایات پر اعتماد کرلیا ہوگا، یا جھوٹوں کی روایات پر وثوق کرلیا ہوگا، نہیں ہرگز نہیں، واللہ یہ حضرات بغایت محتاط ہیں، ان کی تحریروں میں مناقشہ کی گنجائش نہیں ہے، اس سلسلے میں اگر کسی کو شک ہو تو طبقات کی کتابوں میں ان کے

احوال کا مطالعہ کرے۔

اور اگر اس طرح کے شکوک واوھام کو تسلیم کرلیا جائے، تو تاریخ اور اسماء الرجال کی تمام کتابیں ساقط الاعتبار ہوجائیں گی، کیونکہ ان کتابوں میں عموماً علماء کے تذکرے سند مسلسل کے بغیر اختصار کے ساتھ لکھے جاتے ہیں، اگر اس کے بعد بھی کوئی شخص شک وشبہ کا غبار اٹھاتا ہے، تو خوب سمجھ لینا چاہیئے کہ وہ سخت متعصب ہے۔ وہ لائق خطاب نہیں ہے، وہ صرف زجر وعتاب کا مستحق ہے۔(اقامة الحجة)

دوسرے اشکال کا حل

مولانا عبدالحیٔ صاحب نے دوسرے اشکال کا جواب یہ دیا ہے کہ کثرت عبادت وتلاوت کی یہ مقداریں عوام کے حق میں یقیناً مستبعد ہیں، لیکن یہاں گفتگو عوام کی نہیں ہے، اہل اللہ اور خاصان خدا کی ہے، ان حضرات کو رب کریم کی طرف سے خاص ملکوتی قوت عطا ہوتی ہے، جس سے یہ خارق عادات اعمال واحوال ان کے لئے سہل ہوجاتے، اس کا انکار وہی شخص کرسکتا ہے، جو کرامات اور خوارق عادات کا منکر ہو۔

مولانا کے قول کی شرح یہ ہے کہ عوام الناس اور اہل اللہ یعنی اولیاء کرام کے درمیان فرق ہے، اور یہ فرق باجماع امت ثابت ہے، اولیاء کرام اپنے آپ کو، اپنی خواہشات وشہوات کو اپنی طبیعت وارادہ کو اللہ تعالیٰ کی محبت اور اس کے احکام کی اطاعت میں اس

طرح فنا کر دیتے ہیں کہ ان کی اپنی کوئی خواہش باقی نہیں رہتی، وہ وہی کرتے ہیں جو اللہ کو پسند ہے، وہ وہی بولتے ہیں جو اللہ کی مرضی ہے، وہ وہی دیکھتے اور سنتے ہیں، جس میں اللہ کی رضا ہو، ان کا جب یہ حال ہو جاتا ہے، تو اللہ کی طرف سے کچھ خصوصی غیبی قوتیں انہیں ملتی ہیں، جن سے وہ لوگ محروم ہوتے جو اپنی خواہش وشہوت میں گرفتار ہیں، یہ غیبی قوتیں، عام عادات اور عام حالات کے مطابق نہیں ہوتیں، بلکہ خارق عادت ہوتی ہیں، عقیدہ کی مشہور کتاب شرح العقیدة الطحاویہ میں لکھا ہوا ہے کہ:

”جب آدمی کا دین علم اور عمل ہر اعتبار سے صحیح اور کامل ہو جاتا ہے، تو ضروری ہے بوقت ضرورت خرق عادات کا ظہور ہو، چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے وَمَنْ يَّتَّقِ اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّهٗ مَخْرَجًا ۝ وَّيَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ ۝ (جو اللہ کا تقویٰ اختیار کرتا ہے، اللہ تعالیٰ اس کے لئے خلاصی کی راہ پیدا کرتا ہے، اور ایسی جگہ سے اسے روزی پہنچاتا ہے، جہاں اس کا وہم وگمان نہیں پہنچتا) دوسری جگہ ارشاد ہے اِنْ تَتَّقُوا اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّكُمْ فُرْقَانًا۔ اگر تم اللہ سے ڈرو، تو اللہ تعالیٰ تمہارے لئے فیصلہ کن بات عطا فرمائیں گے، اور حق تعالیٰ نے فرمایا وَلَوْ اَنَّهُمْ فَعَلُوْا مَا يُوْعَظُوْنَ بِهٖ لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ وَاَشَدَّ تَثْبِيْتًا ۝ وَّاِذًا لَّاٰتَيْنٰهُمْ مِّنْ لَّدُنَّآ اَجْرًا عَظِيْمًا ۝ وَّلَهَدَيْنٰهُمْ صِرَاطًا

مُسْتَقِیْمًا ۝ (اگر وہ لوگ وہ کام کر لیتے، جس کی انہیں نصیحت کی گئی ہے۔ تو اُن کے لئے بہتر ہوتا، اور زیادہ مضبوطی کی بات ہوتی، اور اس وقت ان کو ہم اپنے پاس سے اجر عظیم عطا فرماتے، اور انہیں سیدھی راہ کی رہنمائی کرتے) اور فرمایا کہ اَلَآ اِنَّ اَوْلِیَآءَ اللّٰہِ لَا خَوْفٌ عَلَیْھِمْ وَلَاھُمْ یَحْزَنُوْنَ ۝ اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَكَانُوْا یَتَّقُوْنَ ۝ لَھُمُ الْبُشْرٰی فِی الْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا وَفِی الْاٰخِرَۃِ ط (سن لو کہ اللہ کے دوستوں پر کوئی خوف نہیں ہے، اور نہ وہ غمزدہ ہوں گے۔ وہ لوگ جو ایمان لائے اور ڈرتے تھے۔ ان کے لئے بشارت ہے دنیاوی زندگی میں اور آخرت میں بھی، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اِتَّقُوْا فِرَاسَۃَ الْمُؤْمِنِ فَاِنَّہٗ یَنْظُرُ بِنُوْرِ اللّٰہِ۔ (مؤمن کی فراست سے ڈرو، اس لئے کہ وہ اللہ کے نور سے دیکھتا ہے) اس کے بعد آپ نے یہ آیت تلاوت فرمائی۔ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّلْمُتَوَسِّمِیْنَ ۝ (ترمذی) اور حدیث قدسی میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ جس نے میرے کسی ولی سے عداوت کی، میں اس سے جنگ کا اعلان کردیتا ہوں، اور بندہ میرا قرب سب سے زیادہ فرائض کے ذریعہ حاصل کرتا ہے، اس سے زیادہ کسی اور چیز سے میرا قرب نہیں ہوتا۔ اور بندہ نوافل کے واسطے سے میرے قریب ہوتا رہتا ہے حتی کہ میں اس سے محبت کرنے لگتا ہوں، اور جب میں اس سے محبت

> کرتا ہوں تو میں اس کا کان بن جاتا ہوں، جس سے وہ سنتا ہے میں اس کی آنکھ بن جاتا ہوں جس سے وہ دیکھتا ہے، اسکا ہاتھ بن جاتا ہوں جس سے وہ پکڑتا ہے۔ اس کا پاؤں بن جاتا ہوں، جس سے وہ چلتا ہے، اور اگر وہ مجھ سے سوال کرتا ہے، تو میں اسے عطا کرتا ہوں، اور اگر وہ مجھے سے پناہ مانگتا ہے، تو میں اسے پناہ دیتا ہوں، اور مجھے کسی کام کے کرنے میں اتنا تردد نہیں ہوتا، جتنا اپنے مؤمن بندے کی روح قبض کرنے میں تردد ہوتا ہے، وہ موت کو ناپسند کرتا ہے اور میں اس کی ناخوشی نہیں چاہتا، حالانکہ موت سے اسے چارہ نہیں''[1]

اس پورے اقتباس پر غور کیجیے، کتنی صراحت کے ساتھ اس میں ذکر کیا گیا ہے کہ اللہ کے نیک بندے جب اسکی مکمل اطاعت کرتے ہیں۔ فرائض سے آگے بڑھ کر نوافل کا اہتمام کرتے ہیں، تو انھیں غیب سے وہ طاقت وقوت عطا ہوتی ہے، جسے خدائی قوت کہنا چاہیے حق تعالیٰ نے خود اس طاقت کی تعبیر اس طرح کی ہے کہ میں اس کا کان، آنکھ اور ہاتھ پاؤں بن جاتا ہوں۔ اس تعبیر کا کیا مطلب ہوا؟ اگر یہ عام انسانی بات ہے، تو یہ کون سی قابل ذکر بات۔ یہ وہی غیبی طاقت ہے۔ جس کے حصول کے بعد اللہ کا ولی عام انسانوں سے ممتاز ہوجاتا ہے اور اس سے ایسے کام صادر ہونے لگتے ہیں، جو کسی طرح عام انسانوں سے صادر نہیں ہو سکتے، یہ حق تعالیٰ کا خصوصی انعام ہے، جو وہ اپنے

---

[1] شرح العقیدہ الطحاویہ ص ۴۲۴، ۴۲۵

خاص بندوں کو عطا فرماتے ہیں، اس کا انکار وہی کر سکتا ہے جو کرامات اور معجزات کا منکر ہو، اور ظاہر ہے کہ منکر معجزات و کرامات معتزلی ہو تو ہو، اہلسنت ہرگز نہیں ہوسکتا۔ ہمارے زمانے میں آدمی اسباب و عادات میں اس طرح گھر گیا ہے اور عالم غیب سے اس کا تعلق ایسا منقطع ہو گیا ہے کہ جہاں کسی نے خرق عادت کی کوئی بات کی، بس تیوریوں پر بل پڑنے لگتے ہیں، ناک بھوں چڑھنے لگتی ہے، جیسے کوئی اجنبی بات آگئی ہو، حالانکہ تعلق مع اللہ کا خاصہ بروئے حدیث ایک یہ بھی ہے کہ آدمی اسباب و عادات سے اوپر اٹھ جاتا ہے، اور اس سے حیرتناک امور کا ظہور ہونے لگتا ہے۔

ان خارق عادت امور کے مختلف نام لئے جاتے ہیں، منجملہ ان ناموں کے ایک نام "برکت" ہے کھانے پینے کی اشیاء میں برکت کو تو سب جانتے ہیں، احادیث میں کھانے پینے اور مال میں برکت کا تذکرہ تواتر کے ساتھ منقول ہے۔ اس کے علاوہ ہر وہ شخص، جسے کسی نیک دل بزرگ اور اہل اللہ کی صحبت میں رہنے کا ذرا بھی اتفاق ہوا ہوگا، اس نے اور کچھ دیکھا ہو، یا نہ دیکھا ہو، مگر کھانے پینے کی برکت کا ضرور مشاہدہ کیا ہوگا۔ کھانا پینا چونکہ عام ضرورت انسانی کی چیز ہے، اور ہر وقت کے محسوسات و مشاہدات میں شامل ہے۔ اس لئے اسکی برکت اور بے برکتی سے کوئی غافل نہیں ہوسکتا، مگر اس کے علاوہ بھی بعض امور برکت کے مورد ہیں، جن کی طرف کم التفات ہوتا ہے، برکت کا حاصل یہ ہے کہ چیز تھوڑی ہو، اور اس سے کام زیادہ ہو جائے۔

وقت میں برکت

برکت کا تعلق جن چیزوں سے ہوتا ہے، ان میں ایک اہم اور بہت اہم چیز وقت ہے۔ یعنی تھوڑے وقت میں اتنا کام ہوجائے، جس کا تصور کرنا مشکل ہو، وقت کی برکت کی طرف عموماً التفات نہیں ہوتا، اسی لئے اس سلسلے کی بات جب اسباب میں گرفتار آدمی سنتا ہے، تو اسے حیرت ہوتی ہے، اور سطحی نظر والا شخص تو انکار پر اتر آتا ہے، حالانکہ ذرا گہرائی اور سنجیدگی سے سوچتا تو بات اس کی سمجھ میں آجاتی۔

ہم یہاں وقت کی برکت کے سلسلے میں ذرا مفصل گفتگو کرنا چاہتے ہیں۔ کیونکہ اوپر جو واقعات بیان کئے گئے ہیں، ان سب کا تعلق وقت کی برکت ہی سے ہے، اور اسی پر لوگوں کو زیادہ اشکال ہوتا ہے کہ اتنی تھوڑی مدت میں اتنی زیادہ زیادہ تلاوت اور نماز کیسے ادا ہوسکتی ہے، جب اہل اللہ کی کثرت تھی، لوگوں کو تلاوت وذکر کا ذوق تھا، عبادات سے انھیں شغف تھا، اس وقت یہ چیزیں نہ حیرت کی تھیں، اور نہ ان پر کوئی اشکال کرتا تھا، اور اب چونکہ امور آخرت کا ذوق رخصت ہوگیا ہے، تو جو باتیں کبھی لوگوں کے لئے بدیہی تھیں اب مشکل ہوگئی ہیں۔

وقت میں برکت کا ثبوت قرآن سے

وقت میں برکت کا تعلق اللہ تعالیٰ کے ارادہ وتصرف سے ہے، اور اس کا فیضان عالم غیب سے ہوتا ہے، اس لئے اس بات کو پہلے قرآن میں تلاش کرنا چاہیے کہ اس میں صراحۃً یا ارشارۃً یا دلالۃً برکت کا سراغ ملتا ہے یا نہیں؟

حق تعالیٰ نے قرآن پاک میں ارشاد فرمایا ہے کہ:

وَاِنَّ یَوْمًا عِنْدَ رَبِّکَ کَاَلْفِ سَنَۃٍ مِّمَّا تَعُدُّوْنَ ٥ اور ایک دن تمہارے رب کے یہاں ایک ہزار برس کے برابر ہوتا ہے، جو تم گنتے ہو، (سورۃ حج آیت ۴۷)

دوسری جگہ ارشاد ہے

یُدَبِّرُ الْاَمْرَ مِنَ السَّمَآءِ اِلَی الْاَرْضِ ثُمَّ یَعْرُجُ اِلَیْہِ فِیْ یَوْمٍ کَانَ مِقْدَارُہٗٓ اَلْفَ سَنَۃٍ مِّمَّا تَعُدُّوْنَ ٥ (سورۃ سجدہ آیت ۵) تدبیر سے اتارتا ہے کام آسمان سے زمین تک پھر چڑھتا ہے وہ کام اسکی طرف ایک دن میں جس کا پیمانہ ہزار برس کا ہے تمہاری گنتی میں۔

ان دونوں آیتوں کا مفہوم اس باب میں بالکل واضح ہے کہ وقت اور زمانے کے پیمانہ کا جو معیار انسانوں کے نزدیک ہے، وہ اللہ کے نزدیک نہیں ہے، بلکہ دونوں میں ہزار گنے کا فرق ہے۔ اس فرق کی وضاحت کئی طرح سے کرتے ہوئے مشہور مفسر قرآن مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی علیہ الرحمہ نے لکھا ہے:

”یا یہ مطلب کہ ہزاروں برس کا کام وہ ایک دن میں کرسکتا ہے،

مولانا امین احسن صاحب فرماتے ہیں:

خدا کے ہاں کے دن اس دنیا کے دنوں سے بالکل مختلف ہیں، خدا کے ہاں کا ایک دن اس دنیا کے دنوں کے حساب سے ایک ہزار

سال کے مانند ہوتا ہے، اس وجہ سے اس کے سیکنڈ اور منٹ بھی اس دنیا کے برسوں کی مدت سے متجاوز ہوتے ہیں۔ انسان ہر چیز کا شمار اپنے چوبیس گھنٹوں کے دن کے حساب سے کرتا ہے، اور خدا کے پروگرام اس کی اپنی تقویم کے اعتبار سے بنتے ہیں اور اس کے ملکوت کے معاملات کو اپنے اوزان اور پیمانوں سے ناپنے اور تولنے کی کوشش نہ کرو، تمہارے ہاں جب صدیاں گزر جاتی ہیں، تو خدا کے وہاں منٹوں اور گھنٹوں کی بات ہوتی ہے"[1]

اس فرق کو بغور ملاحظہ فرمائیے، اور پھر خیال کیجئے کہ جن حضرات کا تعلق دنیا کے اسباب و ذرائع سے زیادہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ خاص یعنی عالم غیب سے ہو چکا ہو، جن کا ربط مادی دنیا سے زیادہ ملکوت سے ہو، اگر ان کے اوقات میں بھی خدائی اوقات کی جھلک نظر آنے لگے تو کیا حیرت کی بات ہے؟ اس کی ایک صاف اور واضح مثال معراج کا واقعہ ہے، تمام اہلسنت کا اتفاق ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو حالت بیداری میں اسی جسد عنصری کے ساتھ معراج ہوئی ہے، اب غور کیجئے کہ معراج کا پورا سفر صرف ایک شب میں بلکہ شب کے ایک حصہ میں واقع ہوا ہے، اتنے ہی وقت میں آپ کا سینہ مبارک شق ہوا، اسمیں انوار ایمان و حکمت بھرے گئے، پھر مختلف مناظر سے گزرتے ہوئے، بعض مقامات پر نمازیں ادا کرتے ہوئے بیت المقدس پہنچے، انبیاء کی امامت فرمائی نماز کے بعد حضرات انبیاءؑ کے خطبے ہوئے، پھر وہاں سے

---

[1] تدبر القرآن ص ٢٦٥ ج ٥

ساتوں آسمانوں کی سیر ہوئی۔ اور زمین سے آسمان تک کا فاصلہ اور ہر آسمان کا درمیانی فاصلہ معلوم ہے کہ پانچ سو برس کی مسافت کا ہے، پھر آسمانوں کے ورے بھی تشریف لے گئے، پھر زمین تک انھیں راستوں سے واپس آئے، جن راستوں سے گئے تھے، بتایئے اتنے کام کے لئے کتنا وقت درکار ہے، اور کتنے وقت میں یہ سارا کام ہوا۔

حقیقت یہ ہے کہ دنیاوی اوقات واعمال کے پیمانوں سے حق تعالیٰ کے معاملات کو بھی پرکھا جائے گا، تو بڑی دشواری پیش آئے گی، انبیاء علیہم الصلوۃ والسلام کے سچے اتباع کی برکت سے ان کے ماننے والوں کو بھی درجے میں وہ برکات نصیب ہوتے ہیں، جو اُن بزرگوں کو اعلیٰ درجہ میں نصیب ہوتے ہیں۔

حضرت سلیمان علیہ السلام کے لئے وقت میں برکت

وقت میں برکت کی ایک واضح اور مشہور مثال، حضرت سلیمان علیہ السلام کا وہ واقعہ ہے، جسے امام بخاری علیہ الرحمۃ نے اپنی کتاب اصح الکتب بعد کتاب اللّٰہ میں پانچ چھ جگہ مختلف سندوں سے نقل کیا ہے، اسکا حاصل یہ ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے ننانوے یا سو ازواج تھیں، انھوں نے ایک روز فرمایا کہ میں آج رات اپنی سب عورتوں کے پاس جاؤں گا۔ اور ان سب سے ایک ایک شہ سوار مجاہد فی سبیل اللہ پیدا ہوگا۔ یہ کہتے ہوئے۔ وہ انشاء اللہ کہنا بھول گئے، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آپ تشریف تو لے گئے اپنی ہر زوجہ کے پاس۔ لیکن کسی سے اولاد نہیں پیدا ہوئی۔ صرف ایک بیوی سے ایک ادھورا بچہ

پیدا ہوا۔[۱]

اس واقعہ میں قابل غور بات یہ ہے کہ صرف ایک رات میں ننانوے یا سو عورتوں کے پاس جانا، دنیاوی حساب سے کیونکر ممکن ہے، اسی دنیوی حساب میں مبتلا ہوکر دور حاضر کے ایک مفکر نے باوجود صحت سند کے اس روایت کا شدو مد سے انکار کیا ہے، ان سے غلطی یہ ہوئی کہ انھوں نے ایک پیغمبر کے معاملات کو عام دنیاوی انسانوں کے معاملہ پر قیاس کرلیا، اگر اسی کو بنیاد بنا کر وقت کی اس برکت کا انکار کیا جائے، تو لازم ہے کہ کھانے اور پانی کی ان تمام برکتوں کا انکار کردیا جائے، جن کا تذکرہ احادیث و سیر کی ہر کتاب میں ملتا ہے۔ کہ چند آدمیوں کا کھانا سینکڑوں افراد کے کئے کافی ہو گیا، سوچنے کی بات ہے کہ اگر وقت کا حساب منٹ سکنڈ سے لگا کر کسی برکت کے واقعہ کا انکار کیا جاسکتا ہے، تو اسکا حساب کیوں نہیں لگایا جاتا کہ دس بارہ آدمیوں کا کھانا اگر چودہ (۱۴) سو آدمیوں پر بانٹ دیا جائے، تو ہر ایک شخص کے حصے میں لقمہ کا کون سا جز آئے گا۔ پھر اس جز سے پیٹ بھرنا کیونکر ممکن ہے۔

کھلی بات ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے لئے وقت میں برکت رکھدی گئی تھی جس کے نتیجے میں یہ محیر العقول بات سامنے آئی۔ انبیاء وصالحین کی سیرتیں، اس طرح کے حیرتناک واقعات سے لبریز ہیں، اگر انکار کا یہی رجحان رہا تو ان حضرات کی سیرت کے زیادہ تر حصے سے دست بردار ہونا پڑے گا۔

---

[۱] ملاحظہ بخاری شریف، کتاب الجہاد، کتاب التوحید و کتاب الایمان، کتاب الانبیاء

حقیقت یہ ہے کہ جن لوگوں کا ایمان غیبی حقائق پر ہے، اور وہ اللہ کے اوپر اور اس کی قدرت و نصرت کے اوپر ایمان رکھتے ہیں۔ نیز وہ مانتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اپنے مخصوص بندوں کو خاص خاص انعامات سے نوازتے ہیں انھیں اس طرح کے واقعات میں کوئی استبعاد نہیں محسوس ہوگا۔ ہاں جس کو غیبی حقائق کا نہ ادراک ہو، اور نہ ان پر یقین رکھتا ہو اور وہ مادی اسباب ہی کو سب کچھ سمجھتا ہو، اس کو یہ بات سمجھانی مشکل ہے۔ تاہم واقعات اسکے سامنے بھی گزرتے ہیں۔ اس لئے مجالِ انکار اس کے لئے بھی نہیں ہے۔

برکت کے مظاہر

برکت کے مظاہر وقت کے علاوہ اور بھی ہیں۔ حدیث میں وارد ہے کہ مؤمن ایک آنت میں کھاتا ہے، کافر سات آنتوں میں کھاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ سات آنت میں کھانے سے ایسا نہیں ہے کہ کافر کا پیٹ کچھ زیادہ بھر جاتا ہے۔ بس ایک جگہ برکت ہے۔ دوسری جگہ نہیں ہے، اسی طرح اللہ تعالیٰ کبھی انسانی قوت و طاقت میں برکت رکھ دیتے ہیں ایک آدمی دیکھنے میں بظاہر نحیف ونزار نظر آتا ہے۔ مگر کام اس سے طاقتوروں جیسا ہوتا ہے۔ صحابۂ کرام اپنے دشمنوں کے مقابلہ میں جسمانی اعتبار سے کچھ زیادہ طاقتور نہ تھے بدن بھی ہلکا ہوتا، کھال بھی سوکھی سوکھی ہوتی، مگر بڑے ڈیل ڈول کے دشمنوں پر بھاری رہتے، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ عین بڑھاپے کے زمانے میں جب کہ ان کی عمر ستر (۷۰) سال سے متجاوز ہوگئی تھی، ایک رکعت میں کھڑے ہوکر پورا

قرآن پڑھ لیا کرتے تھے، یہ طاقت کا کرشمہ نہیں، بلکہ برکت کی کرامت ہے۔ برکت کا تعلق جس شے سے بھی ہوگا، اس میں ایسے ہی حیرتناک احوال جلوہ گر ہونگے۔

رہا یہ کہ برکت ہوتی کب ہے؟ تو یہ خوب سمجھ لینا چاہئیے کہ برکت کا تعلق عالم غیب سے ہے۔ آدمی کو جس قدر اللہ تعالیٰ سے اس کے ذکر سے، اس کے اسماء حسنیٰ سے ربط ہوگا۔ اسی قدر اس کے کاموں میں برکت ہوگی۔ سب سے بابرکت اللہ کا نام ہے۔ چنانچہ برکت وہیں دیکھنے میں آتی ہے۔ جہاں حق تعالیٰ کے ساتھ ربط و تعلق قوی ہوتا ہے۔ اور جس قدر اللہ تعالیٰ سے تعلق کمزور ہوتا ہے برکت میں کمی ہوتی ہے۔

اب ہم تیسرے اشکال کو حل کرنا چاہتے ہیں۔ یعنی یہ کہ بعض احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ عبادت کی کثرت اور اس میں زیادہ انہماک کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پسند نہیں فرمایا ہے۔ اس سوال کو حل کرنے کے لئے ہم ان احادیث پر جن سے کثرت عبادت کی ممانعت معلوم ہوتی ہے، ذرا تفصیلی نظر ڈالنا چاہتے ہیں۔ اور اس کے ساتھ ہم ان احادیث وواقعات کا بھی مطالعہ کریں گے، جن سے پتہ چلتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود کثرت عبادت کا اہتمام کیا ہے۔ صحابہ وتابعین کے حالات تو بیان کئے جا چکے، اب ہم یہ چاہتے ہیں کہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت سے استفادہ کریں اور اس میں جہاں کہیں ظاہری تعارض معلوم ہوتا ہو، اسے براہ راست حدیث کی روشنی میں حل کریں۔

لیکن اس سے پہلے مناسب ہے کہ بدعت کے سلسلے میں بھی کچھ معلومات حاصل کر لیں۔ تا کہ فیصلہ آسان ہو کہ کثرت عبادت کو بے تکلف بدعت کہنے والے کتنے حق بجانب ہیں؟

بدعت کیا ہے؟

حضرت مولانا عبدالحیٔ صاحب لکھنوی کی کتاب اقامۃ الحجہ ہمارے سامنے، ہمارے مضمون کے لئے ماخذ و مصدر وہی کتاب ہے۔ اس میں مولانا نے اس مسئلہ کی وضاحت فرمائی ہے۔ ہم اسے پیش کرتے ہیں۔ مولانا فرماتے ہیں کہ

مشہور محقق علامہ سعدالدین تفتازانی [1] شرح المقاصد کے مبحث الالٰہیات میں فرماتے ہیں کہ ماترید یہ اور اشاعرہ میں جو محققین ہیں، وہ آپس میں ایک دوسرے کو بدعت و ضلالت کی طرف منسوب نہیں کرتے، اس کے برخلاف غالی اور متعصب افراد مسائل فرعیہ کے اختلاف کو بدعت اور

---

[1] مسعود بن عمر بن عبداللہ الامام العلامۃ، حافظ ابن حجر نے لکھا ہے کہ ۷۱۲ھ میں پیدا ہوئے اور علامہ قطب الدین اور عضدالدین سے علم حاصل کیا، علوم وفنون میں ان کا پایہ بہت بلند ہے، بڑی زبردست شہرت حاصل کی ۷۹۱ھ میں انتقال ہوا انتہی۔ بعض حضرات نے انہیں شافعی لکھا ہے، چنانچہ امام سیوطی علامہ کفوی وغیرہ نے اس کی تصریح کی ہے، لیکن علامہ ابن نجیم مصری اور ملا علی قاری نے انہیں حنفی قرار دیا ہے شیخ عبدالفتاح ابوغدہ نے فرمایا کہ توضیح کی شرح میں خود اُن کی عبارتیں تصریح کرتی ہیں کہ وہ حنفی ہیں انہوں نے اقامۃ الحجہ کی تعلیقات میں ان کی متعدد عبارتیں نقل کی ہیں، جن سے ان کا حنفی ہونا محقق ہوتا ہے۔

ضلالت کہنے لگتے ہیں۔ مثلاً یہ اختلاف کہ اگر ذبح کرتے وقت قصداً کوئی بسم اللہ ترک کردے، تو وہ حلال ہے یا حرام؟ یا سبیلین[1] کے علاوہ کہیں اور سے نجاست نکلی تو وضو ٹوٹا یا باقی رہا؟ ولی کے بغیر عورت نے نکاح کیا، تو درست ہوا یا نہیں؟ بغیر سورۂ فاتحہ کے نماز ہوئی یا نہیں؟ یہ فرعی مسائل ہیں۔ اہل تعصب ان مسائل میں بھی آپس میں ایک دوسرے کو بدعت اور گمراہی سے منسوب کرنے لگتے ہیں، حالانکہ انہیں یہ معلوم نہیں کہ بدعت جو مذموم ہے۔ وہ دین کے اندر ایسی نئی بات ہے، جو عہد صحابہ وتابعین میں نہ رہی ہو، اور نہ اس کے اوپر کوئی شرعی دلیل موجود ہو، بعض جاہل، ہر اس کام کو جو دور صحابہ میں نہ رہا ہو مطلقاً بدعت مذمومہ قرار دیتے ہیں، خواہ اس کی برائی پر کوئی دلیل قائم نہ ہو۔ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد سے استدلال کرتے ہیں کہ ایاکم ومحدثات الامور، تم نئے کاموں سے بچو، لیکن انہیں خبر نہیں کہ اس سے مراد وہ نیا کام ہے، جو دین میں شامل نہ ہو اور اسے دین میں داخل کر کے دینی عمل مانا جائے۔ انتہی۔

مجالس الابرار[2] میں ہے کہ بدعت کے دو معنی ہیں، ایک لغوی "معنی" یہ معنی عام ہے اور وسیع مفہوم رکھتا ہے۔ یعنی ہر نیا کام خواہ وہ عادات کی قبیل سے ہو یا عبادات کی جنس سے، دوسرے اس کا شرعی معنی، یہ معنی خاص ہے، اور اس کا ایک محدود مفہوم متعین ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ صحابہ کے بعد دین میں کچھ اضافہ کرنا یا کمی

---

[1] یعنی پیشاب پاخانہ کے راستے

[2] یہ کتاب شیخ احمد رومی کی ہے، کتاب بہت نفیس اور قابل اعتماد ہے۔ (مولانا لکھنویؒ)

کرنا، جب کہ اس کی اجازت شارع کی طرف سے نہ ہو نہ قول سے، نہ عمل سے، نہ صراحۃً، نہ اشارۃً، اور حدیث میں (جو كُلُّ بِدْعَةٍ ضَلَالَةٌ کہا گیا ہے کہ ہر بدعت گمراہی ہے) یہ عموم اس کے شرعی معنی کے لحاظ سے ہے) (انتہی ملخصاً)

مجالس الابرار میں یہ بھی فرمایا ہے کہ اگر صحابہ کے بعد لوگ کسی نئی بات پر متفق ہوگئے ہوں تو اس سے دھوکہ میں نہیں پڑنا چاہیئے۔ بلکہ ان کے احوال واعمال کی تحقیق وتفتیش کرنی چاہیئے، کیونکہ سب سے بڑا عالم اور سب سے زیادہ اللہ سے قرب رکھنے والا وہی شخص ہوگا، جو صحابہ سے زیادہ مشابہت رکھتا ہو، اور ان کے طریقوں کو زیادہ پہچانتا ہو، کیونکہ دین انہیں سے حاصل ہوا ہے، اور صاحب شریعت سے دین کی نقل وروایت کا مدار انہیں پر ہے۔ (انتہی)

شرعة الاسلام [1] میں ہے کہ، سنت جس کو مضبوط پکڑنا ضروری ہے، اس سے مراد وہ طریقہ ہے، جو اُن زمانوں میں جاری رہا ہو، جن کے خیر اور صلاح ہونے کی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان فیض ترجمان سے گواہی مل چکی ہے، یہ خلفاء راشدین اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کا دور ہے، اس کے بعد تابعین کا زمانہ! ان تینوں زمانوں کے بعد اگر ان کے طریقے کے خلاف دین میں کوئی نئی چیز پیدا کی گئی ہو۔ تو وہ بدعت ہے، اور ہر بدعت گمراہی

---

[1] یہ کتاب رکن الاسلام محمد بن ابوبکر واعظ کی ہے۔ جو امام زادہ کے نام سے معروف ہیں۔ محمود بن سلمان کفوی نے اعلام الاخبار میں لکھا ہے کہ یہ امام، فاضل ادیب تھے، شریعت وحقیقت کے جامع تھے، واعظ تھے، شمس الائمہ حلوانی کے شاگرد شمس الائمہ بکر بن محمد زرنجری سے تلمذ کا شرف حاصل تھا۔ ۵۷۳ھ میں انتقال ہوا۔

ہے، صحابہ کرام ہر اس طریقہ اور رواج پر سخت نکیر کرتے تھے، جو عہد نبوت میں نہ تھا۔ اسے بعد میں کسی نے ایجاد کیا، خواہ وہ کم ہو یا زیادہ، چھوٹا ہو یا بڑا۔

اس کی شرح میں علامہ یعقوب بن سید علی رومی [۱]، مفاتیح الجنان شرح شرعة الاسلام میں لکھتے ہیں کہ اس سے مراد دین میں ہر وہ نئی بات ہے، قرون اولی کے دستور اور طریقے کے خلاف ہو، وہ گمراہی ہے ورنہ بعض نئی چیزیں بہتر اور مقبول ہیں، جیسے دینی علوم میں اشتغال اور ان کی تدوین (جس کا دور صحابہؓ میں اہتمام نہ تھا) اور بعض نئی باتیں بری اور مردود ہیں، یہ وہ چیزیں، جنہیں ان کے بعد ان کے طریق سے ہٹ کر ایجاد کیا گیا ہے، کہ اگر انہیں وہ حضرات دیکھ لیں، تو ان پر نکیر کریں۔

الطريقة المحمدية میں محمد آفندی برکلی رومی [۲] نے لکھا ہے کہ ایک سوال یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ کل بدعة ضلالة۔ ہر بدعت گمراہی ہے۔ لیکن فقہا لکھتے ہیں کہ بدعت کبھی مباح ہوتی ہے، جیسے چھلنی کا استعمال، گیہوں کے آٹے کا مستقل کھانا، اور اسے پیٹ بھر کر کھانا، اور کبھی مستحب ہوتی ہے، جیسے مدارس کی تعمیر، مسجدوں میں منارہ بنانا، اور

---

[۱] روم کے مدرسوں کے استاد، میدان علم کے شہسوار، اپنے ہم عصروں پر فائق، رتبۂ کمال پر فائز اپنے امثال میں مرکز اشارہ ۹۳۱ھ میں انتقال ہوا۔ (مولانا لکھنوی)

[۱] شیخ عبدالحئی نے شرح الطريقة المحمدية میں ان کا تعارف کرایا ہے کہ علوم ومعارف کی تحصیل میں نشوونما پائی۔ اور ان میں مہارت تامہ حاصل کی۔ ان سے مخلوق خدا کو بہت نفع پہنچا ۹۸۱ھ میں وصال ہوا۔ (مولانا فرنگی محلی)

کتابوں کی تصنیف بلکہ کبھی واجب بھی ہوتی ہے۔ جیسے ملحدین کے اعتراضات کا جواب دینا۔

اس سوال کا جواب یہ ہے، بدعت کے دو معنی ہیں، ایک لغوی، جو عام ہے۔ یعنی مطلق نئی بات، خواہ وہ عادۃً ہو یا عبادۃً، یہ ابتداع (نئی بات پیدا کرنی) کا حاصل مصدر ہے، جیسے ارتفاع کا حاصل رفعت اور اختلاف کا حاصل مصدر خلفت، فقہاء کی عبارتوں میں یہ مفہوم بطور مقسم کے استعمال ہوا ہے۔ (یعنی اس سے قسمیں نکلتی ہیں) اس سے فقہاء ہر وہ بات مراد لیتے ہیں جو عہد نبوت کے بعد وجود میں آئی ہو۔

دوسرا معنی اس کا شرعی ہے، جو خاص مفہوم رکھتا ہے۔ وہ ہے دور صحابہ کے بعد دین میں کچھ اضافہ کر دینا، یا اس میں کچھ کمی کر دینا۔ جب کہ شارع کی طرف سے اس کی قول و عمل سے یا صراحت واشارہ سے اجازت ثابت نہ ہو، اس تعریف کے لحاظ سے، اس کے دائرے میں عادات سرے سے نہیں آتیں، بلکہ اس کا تعلق بعض عقائد اور عبادات کی بعض صورتوں سے ہوتا ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو ہر بدعت کو گمراہی قرار دیا ہے تو آپ کی مراد یہی بدعت ہے، اس کی دلیل یہ ہے کہ آپ ہی نے فرمایا ہے:-

عَلَيْكُمْ بِسُنَّتِيْ وَسُنَّةِ الْخُلَفَآءِ الرَّاشِدِيْنَ۔

تم میری سنت کو اور خلفاء راشدین کی سنت کو مضبوطی کے ساتھ تھامو۔

نیز آپ ہی کا ارشاد ہے:-

اَنْتُمْ اَعْلَمُ بِاَمْرِ دُنْيَاكُمْ

تم اپنے دنیاوی امر کو اچھا جانتے ہو۔

اور آپ کا فرمان ہے کہ:-

مَنْ اَحْدَثَ فِیْٓ اَمْرِنَا هٰذَا مَالَیْسَ مِنْهُ فَهُوَرَدٌّ

جس نے ہمارے اس امر میں (یعنی دین میں) کوئی نئی بات پیدا کی، جو اس میں سے نہیں ہے وہ رد ہے۔ انتہٰی

اور حواشی الطریقة المحمدیه میں ہے کہ خلفاء راشدین کے عہد میں جو طریقہ رائج ہوا ہو، وہ بدعت نہیں ہے، کیونکہ ان کی سنت رسول ہی کی سنت کی طرح ہے، کیونکہ آپ نے ان کے طریقے کو بھی مضبوطی کے ساتھ پکڑنے کا حکم دیا ہے۔

اور شیخ عبدالغنی نابلسی[1] نے الحدیقه الندیه شرح الطریقة المحمدیه میں (بعد الصدر الاول) کی شرح کرتے ہوئے لکھا ہے کہ صدر اول سے مراد وہ صحابہ اور سلف ہیں، جو عہد رسالت میں موجود تھے، کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ تم میری اور میرے بعد خلفاء راشدین کی سنت کو مضبوطی سے پکڑو، تو جو کچھ اُن کے دور میں وجود میں آیا وہ بدعت نہیں ہے۔ بدعت وہ ہے جو ان کے زمانے اور تابعین وتبع تابعین کے زمانے کے بعد وجود میں آیا ہے۔

علماء کے یہ تمام ارشادات اس بات کی صراحت کرتے ہیں کہ صحابہؓ،

[1] شیخ عبدالغنی نابلسی مشہور حنفی محقق عالم ہیں، ان کی کتابیں نہایت محققانہ اور منصفانہ ہوتی ہیں سنہ ۱۱۴۳ھ میں وفات ہوئی۔

تابعین بلکہ تبع تابعین کے دور میں جو کچھ بغیر انکار کے وجود میں آیا، وہ بدعت میں داخل نہیں ہے، اور نہ ان پر عمل کرنا گمراہی ہے۔

حاصل کلام یہ ہے کہ جو کچھ عہد رسالت میں ہوا، خواہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے خود کیا یا حضرات صحابہؓ نے کیا، اور آپ نے اس پر نکیر نہیں کی، وہ بالاتفاق بدعت نہیں ہے۔

اور جو کچھ آپ کے عہد مبارک میں نہیں تھا۔ بلکہ آپ کے بعد اس کا وجود ہوا، وہ عام لغوی معنی کے اعتبار سے بدعت ہے۔ یعنی عہد نبوی کے بعد نئی چیز مطلقاً۔ اس کی دو قسمیں ہیں:-

ا۔ وہ کام عادات کی قبیل سے ہو، یہ سرے سے بدعتِ ضلالت نہیں ہے۔ جب تک اس کی قباحت کی شرعی دلیل نہ ہو۔

۲۔ وہ کام عبادات کی قبیل سے ہو۔

اس دوسری قسم کی چند قسمیں ہیں۔

ا۔ ایسا کام جو دور صحابہؓ میں وجود میں آیا، خواہ تمام یا بعض صحابہؓ نے اسے کیا ہو، یا ان کے زمانے میں وہ کام ان کی اطلاع وخبر میں ہوا۔

۲۔ تابعین کے زمانے میں ہوا ہو۔

۳۔ تابعین کے بعد تبع تابعین کے دور میں ہوا ہو۔

۴۔ تبع تابعین کے بعد اس کا وجود ہوا۔

پھر جو کام دور صحابہؓ میں ہوا۔ اس پر یا تو صحابہؓ کی طرف سے انکار ہوا ہوگا، یا اس کے جاننے کے باوجود صحابہؓ نے اس پر نکیر نہ کی ہوگی۔

اگر صحابہؓ نے اس کا انکار کیا ہے تو وہ بدعت ضلالت ہے اور کل بدعۃ ضلالۃ میں داخل ہے۔

نماز عید سے پہلے خطبہ بدعت ہے

اس کی مثال یہ ہے کہ مروان بن الحکم نے مدینہ طیبہ میں نماز عید سے پہلے خطبہ دیا، اس پر حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ نے نکیر کی، چنانچہ بخاری و مسلم میں یہ روایت موجود ہے۔ حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عید الفطر اور عید الاضحیٰ کے دوگانہ کے لئے جب عید گاہ تشریف لے جاتے، تو پہلے نماز ادا کرتے، پھر لوگوں کے سامنے کھڑے ہوتے، اور لوگ اپنی صفوں میں بیٹھے رہتے، آپ وعظ کہتے، انہیں وصیت نصیحت کرتے، آپ کا یہ دستور رائج و باقی رہا۔ پھر ایک مرتبہ میں مروان کے ساتھ جب وہ مدینہ کا گورنر تھا۔ عید الاضحیٰ یا عید الفطر کے موقع پر عید گاہ پہنچا تو وہاں ایک منبر رکھا ہوا تھا۔ جسے کثیر بن صلت نے بنوایا تھا، میں نے دیکھا کہ مروان اس پر نماز سے پہلے ہی چڑھنے کا ارادہ کر رہا ہے، میں نے اس کا کپڑا پکڑ کر کھینچا، مگر اس نے مجھے ہی گھسیٹ لیا، اور منبر پر چڑھ گیا۔ اور نماز سے پہلے خطبہ دیا۔ میں نے اس سے کہا کہ خدا کی قسم تم نے بدل دیا۔ اس نے کہا ابو سعید، جو بات تم جانتے تھے، اب وہ بات ختم ہو گئی۔ میں نے کہا کہ واللہ جو کچھ میں جانتا ہوں وہ اس سے بہتر ہے، جو میں نہیں جانتا، اس نے کہا، کہ لوگ ہماری بات سننے کے لئے نماز کے بعد نہیں رکتے، اس لئے میں نے اسے نماز سے پہلے کر دیا۔

خطبہ جمعہ میں دعاء کے لئے ہاتھ اٹھانا بدعت

ایسے ہی جمعہ کے خطبہ میں دعاء کے لئے ہاتھ اٹھانا بھی بدعت ہے، یہ کام پہلے پہل بشر بن مروان نے کیا تھا، اور اس پر حضرت عمارہ نے نکیر فرمائی تھی، چنانچہ مسلم اور ابوداؤد میں روایت ہے کہ حضرت عمارۃ بن رویبہ رضی اللہ عنہ نے بشر بن مروان کو دیکھا، کہ وہ جمعہ کے روز دعا کر رہا ہے۔ آپ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ ان دونوں ہاتھوں کا برا کریں، میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس منبر پر دیکھا ہے، انہوں نے انگشت سے اشارہ کر کے بتایا کہ آپ اس سے زیادہ نہیں کرتے تھے۔

دوسری صورت یہ ہے کہ صحابہؓ کی طرف سے اس عمل پر نکیر نہ پائی گئی ہو، بلکہ ان کی رضامندی اور موافقت اس میں شامل ہو۔ اس کام پر شرعاً بدعت کا اطلاق نہیں ہوگا۔ اگرچہ لغوی اعتبار سے اسے بدعت کہہ دیا جائے۔

جمعہ کی پہلی اذان بدعت نہیں ہے

اس کی مثال جمعہ کی پہلی اذان ہے، بخاری، ترمذی اور ابن ماجہ میں روایت موجود ہے کہ حضرت سائب بن یزید نے فرمایا کہ جمعہ کے دن پہلی اذان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور ابوبکر صدیق وعمر فاروق رضی اللہ عنہما کے دور میں اس وقت ہوتی تھی جب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا دور آیا، اور لوگوں کی تعداد بڑھ گئی، تو تیسری اذان کا انہوں نے مقام زورار میں اضافہ کیا۔ امام نووی نے فرمایا کہ اسے تیسری اذان اس لئے کہا کہ اقامت کو بھی اذان ہی کہا

جاتا تھا۔

ایک شہر میں متعدد نماز عید بدعت نہیں ہے

اسی طرح ایک شہر میں کئی کئی عید کی نماز بھی بدعت نہیں، شیخ الاسلام ابن تیمیہ نے منہاج السنہ میں لکھا ہے کہ امیر المومنین حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے اپنے عہد خلافت میں جامع مسجد میں دوسری نماز عید قائم فرمائی، ورنہ عہد رسالت اور عہد صدیقی میں نیز عہد فاروقی وعثمانی تک معروف دستور یہی تھا کہ شہر بھر میں ایک ہی جمعہ ہوتا تھا۔ اور ایک ہی نماز عید بھی ہوا کرتی تھی، جب حضرت علی رضی اللہ عنہ کا دور آیا تو لوگوں نے عرض کیا کہ شہر میں بہتیرے کمزور افراد ہیں، جو عیدگاہ نہیں جاسکتے، ان کے لئے کسی آدمی کو متعین کر دیجئے کہ انہیں عید کی نماز پڑھا دے۔

وعظ کہنا بدعت نہیں ہے

اس کی ایک مثال وعظ کہنا بھی ہے مشہور مورخ علامہ تقی الدین احمد بن علی مقریزی نے اپنی کتاب المواعظ والاعتبار بذکر الخطط والآثار میں عمر بن شبہ کے حوالے سے لکھا ہے کہ حضرت حسن بصری سے پوچھا گیا کہ یہ وعظ کا دستور کب سے ہوا۔ فرمایا کہ عہد عثمانی سے پوچھا گیا ابتداءً وعظ کس شخص نے کہنا شروع کیا۔ فرمایا کہ تمیم داری نے، امام زہری سے منقول ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مسجد میں سب سے پہلے، حضرت تمیم داری نے وعظ کہا، انہوں نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے

اجازت مانگی تھی کہ لوگوں کو تذکیر کریں۔ انہوں نے اجازت نہیں دی۔ پھر اپنی خلافت کے آخر دور میں اتنی اجازت دے دی تھی کہ میرے آنے سے پہلے پہلے تک وعظ کہہ سکتے ہو، پھر حضرت تمیم نے حضرت عثمانؓ سے اجازت مانگی، تو انہوں نے دودن وعظ کہنے کی اجازت دی۔ ایک جمعہ کے دن (اور ایک کسی اور دن) چنانچہ وہ وعظ کہا کرتے تھے۔

بیس رکعت تراویح بدعت نہیں ہے

منجملہ ان امور کے جو عہد صحابہؓ میں رواج میں آئے، رمضان کی راتوں میں بیس رکعت تراویح کے لئے لوگوں کا اکھٹا ہونا ہے۔ اس کا دستور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں ہوا۔ اور اسی کے حق میں انہوں نے فرمایا کہ نعمت البدعۃ ہی، یہ ایک اچھی بدعت ہے، اس کو انہوں نے لغوی معنی کے اعتبار سے بدعت کہا، اور اسے حسن کہہ کر یہ اشارہ کردیا کہ لغوی معنی عام کے لحاظ سے ہر نئی چیز گمراہی نہیں ہے، انہوں نے اس کا شرعی معنی نہیں مراد لیا ہے۔ ورنہ اعتراض ہوتا کہ ہر بدعت تو گمراہی ہے، پھر یہ حسن کیسے ہوگئی، اس کی تحقیق میں (مولانا عبدالحی صاحب) نے تحفة الاخبار فی احیاء سنة سید الابرار میں کی ہے۔

وتر میں دعائے قنوت کے لئے ہاتھ اٹھانا اور تکبیر کہنا بدعت نہیں ہے!

بعض احناف نے لکھا ہے کہ وتر میں دعائے قنوت کے لئے ہاتھ اٹھانا اور تکبیر کہنا واجب ہے، یہ بات گو کہ مشہور ہے، لیکن محققین حنفیہ نے تصریح کی

ہے کہ یہ واجب نہیں ہے، چنانچہ بحر الرائق میں علامہ ابن نجیم نے لکھا ہے کہ شارح (یعنی علامہ زیلعی شارح کنز الدقائق) نے تکبیر قنوت کے ترک سے سجدہ سہو کو واجب قرار دیا ہے۔ لیکن مناسب یہ ہے کہ واجب نہ ہو، اس لئے کہ وہی اصل ہے، اور وجوب کی کوئی دلیل نہیں ہے، اسکے برخلاف وجوب کے تکبیرات عیدین پر دلیل موجود ہے، وہ اس پر مداومت ہے۔ نیز اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ:۔

وَاذْكُرُوا اللّٰهَ فِيْٓ اَيَّامٍ مَّعْدُوْدَاتٍ ط گنتی کے چند دنوں میں اللہ کو یاد کرلو۔

اور فتاوٰی قاضی خاں میں ہے تکبیر قنوت کے وقت ہاتھ اٹھانا واجب نہیں ہے، جیسے تکبیر تحریمہ کے وقت ہاتھ اٹھانا واجب نہیں ہے، اس لئے اس کے ترک سے سجدۂ سہو واجب نہ ہوگا۔

بعض علماء نے اس کے متعلق غلو کیا ہے، اور اسے بدعات میں شمار کیا ہے، کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کا ثبوت نہیں ہے۔ لیکن یہ ایک غلط خیال ہے، کیونکہ اگرچہ یہ رسول اللہ ﷺ سے براہ راست ثابت نہیں ہے، لیکن بعض صحابہ سے ثابت ہے، اس لئے یہ بدعت نہیں ہوسکتی، بلکہ یہ سنت ہے، یا کم از کم مستحب ہے۔

مولانا فرماتے ہیں کہ اس سلسلے میں مجھ سے ۱۲۸۸ھ میں سوال کیا گیا تھا کہ زید کہتا ہے کہ وتر کی تیسری رکعت میں قرأت کے بعد، قنوت سے پہلے ہاتھ اٹھانا، اور اس وقت تکبیر کہنا۔ جیسا کہ مروج ہے، بدعت سیئہ ہے، کیونکہ

اس جگہ اس کا ثبوت حدیث سے نہیں ہے۔ تو کیا اس کی یہ بات درست ہے، اور کیا تکبیر کہنا اور ہاتھ اٹھانا سنت ہے یا مستحب؟

میں نے اس کا جواب لکھا کہ قنوت کے وقت تکبیر کہنا اور ہاتھ اٹھانا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت نہیں ہے، صاحب ہدایہ نے ہاتھ اٹھانے کی دلیل میں رسول اللہ ﷺ کا یہ ارشاد نقل کیا ہے کہ لَا تَرْفَعُ الْاَیْدِیْ اِلَّا فِیْ سَبْعِ مَوَاطِنَ: تَکْبِیْرَۃُ الْاِفْتِتَاحِ وَ تَکْبِیْرَۃُ الْقُنُوْتِ وَ تَکْبِیْرُ الْعِیْدَیْنِ وَالْاَرْبَعُ فِیْ الْحَجِّ، ہاتھ صرف سات جگہ اٹھائے جائیں گے۔ تکبیر تحریمہ میں، تکبیر قنوت میں، تکبیر عیدین میں۔ اور چار جگہ حج میں۔

لیکن علامہ عینی نے بنایه شرح الهدایه میں کئی طریقوں سے اس کی تخریج کرنے کے بعد لکھا ہے کہ ان روایات میں غور کرو۔ کیا کسی روایت میں قنوت کے وقت رفع یدین کا ذکر ملتا ہے، یہ بات صرف ہمارے فقہاء کے یہاں ان کی کتابوں میں ملتی ہے۔ چنانچہ مصنف (ہدایہ) نے بھی اس کا ذکر کیا ہے (باب صفة الصلوٰة)

نیز انھوں نے باب الوتر میں لکھا ہے کہ میں باب صفة الصلوٰة میں لکھ چکا ہوں کہ حدیث میں قنوت کا ذکر نہیں ہے، چنانچہ بخاری، بزار اور طبرانی کی روایتیں اس کے ذکر سے خالی ہیں۔

علامہ محمد معین سندی المتوفی ۱۱۶۱ھ نے اپنی کتاب "دراسات اللبیب فی الاسوة الحسنة بالحبیب" میں لکھا ہے کہ وہ مسائل جن کی کوئی اصل

نہیں پائی جاتی، ایک وتر کے قنوت سے پہلے تکبیر کا وجوب ہے[۱] میں نے اس کے لئے کوئی مرفوع حدیث نہیں پائی[۲] پھر ایسی کوئی بات مجھے کہاں سے ملتی، جس سے ثابت ہوتا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پر مواظبت فرمائی ہے، اور اس کے تارک کو وعید کا مورد قرار دیا ہے، اگر ایسا ہوتا تو وجوب کا قول صحیح ہوتا۔ لیکن اس کے باوجود حنفیہ سے حسن ظن کی وجہ سے میں اس پر عمل کرتا ہوں۔ اور اسے کبھی ترک نہیں کرتا۔ البتہ وجوب کا اعتقاد نہیں رکھتا۔

یہی حال تکبیر قنوت کے وقت ہاتھ اٹھانے کے وجوب کا بھی ہے، اس بارے میں کسی بڑے تابعی کا کوئی صحیح اثر میرے نزدیک ثابت نہیں، تو بھلا صحابی کا اثر کہاں سے ثابت ہوتا۔ (انتہی)

دراسات اللبیب میں انہوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ مصنف ابن ابی شیبہ میں حضرت عبد اللہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے ثابت ہے کہ وتر کے قنوت میں

---

[۱] شیخ عبد الفتاح ابو غدہ نے تعلیقات میں شیخ عبد اللطیف سندی کے حوالے سے لکھا ہے کہ حنفیہ کی کتابوں میں تصریح ہے کہ قنوت کی تکبیر مستحب ہے، اور جس نے اس کے وجوب کا ذکر کیا ہے، اس پر اعتراض ہوا ہے۔ اس لئے حنفیہ کی طرف اسکے وجوب کو منسوب کرکے، اس پر اعتراض کرنا انصاف کے خلاف ہے، پھر شیخ عبد اللطیف نے کتب حنفیہ سے اس کے استحباب کی تصریحات نقل کی ہیں، ملاحظہ ہو ذب الذبابات ص ۴۸ ج ۲

[۲] شیخ ابو غدہ نے یہاں بھی تعلیقات میں شیخ عبد اللطیف سندی کے حوالے سے لکھا ہے کہ حدیث میں مرفوع کی قید بتا رہی ہے کہ انھوں نے مرفوع حدیث پائی ہے، پھر اس کے ہوتے ہوئے، ان کا یہ عام دعوٰی کہ اسکی کوئی اصل موجود نہیں، مناسب دعوٰی نہیں ہے اس عام دعوٰی سے تو اقوال صحابہ کی بھی نفی ہو جاتی ہے، حالانکہ متعدد صحابہ سے تکبیر قنوت ثابت ہے، انکا ذکر جلد ہی ان شاء اللہ آئے گا۔

ہاتھ اٹھاتے تھے، نیز انھیں کی روایت سے یہ بھی ثابت ہے، کہ جب وتر کی آخری رکعت میں وہ قرأت سے فارغ ہوتے تھے، تو تکبیر کے علاوہ اور کوئی عمل نہیں کرتے تھے، چنانچہ حضرت اسود فرماتے ہیں کہ عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ جب قراءت سے فارغ ہوتے۔ (یعنی تیسری رکعت میں) تو تکبیر کہتے اور رکوع میں چلے جاتے، حنفیہ نے دو جگہوں میں ان کے خلاف کیا، انھوں نے قنوت میں رفع یدین ایجاد کیا، چنانچہ تکبیر کے ساتھ ہاتھ اٹھانے کا اضافہ کیا۔[1]

امام محمد علیہ الرحمۃ نے کتاب الآثار میں مشہور تابعی جلیل ابراہیم نخعی کا قول نقل کیا ہے کہ وتر میں قنوت واجب ہے، رمضان میں بھی اور غیر رمضان میں بھی، جب قنوت پڑھنے کا ارادہ ہو، تو تکبیر کہو[2] (انتہٰی)

غایۃ البیان شرح ھدایہ میں علامہ قوام الدین اتقانی المتوفی ۷۵۸ھ نے لکھا ہے کہ امام طحاوی نے شرح معانی الآثار میں امام نخعی سے نقل کیا ہے کہ انھوں نے فرمایا:

ترفع الا یدی فی سبعة مواطن فی افتتاح الصلوٰۃ وفی التکبیر

---

[1] شیخ ابوغدہ لکھتے ہیں کہ ان کے گمان میں ایک تو قنوت کے لئے تکبیر نئی چیز ہے، دوسرے تکبیر کے ساتھ رفع بھی نئی چیز ہے۔ مولانا لکھنوی، ان دونوں باتوں کا جواب آگے چل کر دیں گے۔

[2] امام دارمی نے سنن میں اپنی سند سے امام اعمش سے نقل کیا ہے کہ میں نے ابراہیم کا کوئی قول کسی مسئلہ میں ان کی رائے سے نہیں سنا: اسکا مطلب یہ ہوا کہ اس قول اور آگے آنے والے قول کی سنت میں اصل موجود ہے (شیخ ابوغدہ)

للقنوت فی الوتر وفی العیدین و عند استلام الحجر الاسود علی الصفا والمروۃ وبمجمع وعرفات وعند المقامین عند الجمر تین ذکرہ فی باب رفع الیدین عند رویۃ البیت۔

سات جگہیں ہیں، جہاں ہاتھ اُٹھائے جائیں گے۔ نماز کے آغاز میں، وتر میں قنوت کی تکبیر کے لئے، عیدین میں، حجر اسود کے استلام کے وقت، صفا اور مروہ پر اور عرفات و مزدلفہ میں اور دو مقام جمرتین کے پاس۔ امام طحاوی نے اسے باب رفع الیدین عند رویۃ البیت میں ذکر کیا ہے۔

نہایہ شرح ہدایہ میں امام مزنی سے منقول ہے، وہ فرماتے ہیں کہ امام ابوحنیفہ نے قنوت میں ایک تکبیر کا اضافہ کیا ہے، سنت سے اسکا ثبوت نہیں ہے۔ اور نہ قیاس اس پر دلالت کرتا ہے، ابوالنصر اقطع نے مختصر القدوری کی شرح میں لکھا ہے کہ یہ بات درست نہیں ہے۔ یہ تکبیر، حضرت علی، حضرت ابن عمر اور حضرت براء بن عازب سے منقول ہے اور قیاس بھی اس پر دلالت کرتا ہے، علامہ ابن قدامہ نے المغنی میں لکھا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ جب وہ وتر میں قرأت سے فارغ ہوتے، تو تکبیر کہتے شیخ ابراہیم حلبی غنیۃ المتملی شرح منیۃ المصلی میں لکھتے ہیں کہ قنوت کی تکبیر اور اس میں ہاتھ اٹھانا حضرت عمرؓ، حضرت علیؓ، حضرت ابن مسعودؓ حضرت ابن عباسؓ، حضرت ابن عمرؓ اور حضرت براء بن عازبؓ سے منقول ہے، ایسے ہی عیدین کی تکبیرات میں حضرت عمرؓ سے مروی ہے، اس کو

اثرم نے اور بیہقی نے اپنی سنن کبریٰ میں ذکر کیا ہے"۔

حاصل یہ ہے کہ ہاتھوں کا اٹھانا اور قنوت کے وقت تکبیر کہنا، اگر چہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے براہ راست ثابت نہیں ہے، لیکن اسکا ثبوت، جب بعض صحابہ اور بعض تابعین سے ہے، جیسا کہ علامہ عینی، ابن قدامہ، ابراہیم حلبی اور اتقانی وغیرہ نے ذکر کیا ہے، تو بدعت سیئہ کیونکر ہوگا، ہاں تکبیر اور ہاتھ اٹھانے کے وجوب کا ثبوت مشکل ہے، کیونکہ وجوب کی کوئی دلیل نہیں ہے۔ بس زیادہ سے زیادہ یہ ہے کہ اگر صحابہ و تابعین کی اقتداء کی نیت سے کوئی اس کو کریگا تو ثواب کا مستحق ہوگا۔ اور اگر نہ کریگا تو نہ عذاب ہے نہ عتاب۔ واللہ اعلم بالصواب وعندہ حسن الثواب۔

بعض امور جن کو کسی صحابی نے بدعت کہا

حدیث کی کتابوں میں ایسے واقعات منقول ہیں کہ کسی صحابی نے کوئی نئی بات دیکھی اور اسے بدعت قرار دیا، تو اس سلسلے میں یہ دیکھنا چاہیئے کہ، اس بدعت کہنے میں نکیر کا پہلو قولاً یا عملاً ظاہر ہوتا ہے، یا تحسین کا پہلو۔

اگر نکیر کا پہلو ظاہر ہوتا ہے، تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ان کے نزدیک فعل قبیح ہے اور اگر ان کے قول و عمل سے اسکی تحسین معلوم ہوتی ہے تو اسکا مطلب بجز اس کے اور کچھ نہیں ہے کہ انھوں نے اسے لغوی معنی کے اعتبار سے بدعت کہا ہے، بدعت کا شرعی معنی جو کہ ضلالت ہے مراد نہیں لیا ہے۔

پہلی مثال

پہلی صورت کی مثال میں حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کا واقعہ پیش

کیا جا سکتا ہے جسے امام ابو داؤد نے حضرت مجاہد سے نقل کیا ہے، فرماتے ہیں کہ میں حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ کے ساتھ تھا۔ ایک شخص نے ظہر یا عصر کی نماز میں تثویب[1] کی۔ حضرت ابن عمرؓ نے فرمایا، یہاں سے مجھے لے چلو، یہ بدعت ہے۔

اور علامہ بدر الدین عینی نے ہدایہ کی شرح بنایہ میں نقل کیا ہے۔ اور مبسوط میں بھی ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ایک موذن کو دیکھا کہ عشاء کی نماز کے لئے تثویب کر رہا ہے، آپ نے فرمایا کہ اس بدعتی کو مسجد سے نکالو۔

ایک اشکال اور اسکا جواب

جب تثویب کے بدعت ہونے پر دو صحابی کے یہ دو اثر منقول ہیں، تو اس کے باوجود فقہاء نے پانچوں نمازوں میں کس دلیل سے تثویب کو بہتر قرار دیا ہے؟

اسکا جواب یہ ہے کہ تثویب کے مسئلے میں تین قول ہیں:

پہلا قول یہ ہے کہ فجر کے علاوہ ہر نماز میں مکروہ ہے، فجر کا وقت چونکہ نیند اور غفلت کا ہے اس وقت اسلئے دوبارہ اطلاع کر دینی مناسب ہے، اور اسکی دلیل میں حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کی وہ روایت پیش کی جا سکتی ہے، جسے امام ابو داؤد نے نقل کیا ہے، فرماتے ہیں کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نماز فجر کے لئے جا رہا تھا، تو جس شخص کے پاس سے آپ کا گزر

---

[1] تثویب: کا مطلب یہ ہے کہ اذان کے بعد دوبارہ نماز کا اعلان کیا جائے، یا اس کی اطلاع کی جائے مثلاً اذان واقامت کے درمیان اَلصَّلٰوۃُ خَیْرٌ مِّنَ النَّوْمِ یَا اَلصَّلٰوۃُ رَحِمَکُمُ اللّٰہُ پکارا جائے (شیخ ابوغدہ)

ہوتا، اسے نماز کے لئے پکارتے، یا پاؤں سے حرکت دیتے۔

اس پر ملا علی قاری نے مرقاۃ المفاتیح میں لکھا ہے کہ اس سے میرے خیال میں فی الجملہ تثویب کی مشروعیت ثابت ہوتی ہے۔

دوسرا قول یہ ہے کہ امراء و حکام کے لئے تثویب جائز ہے اور ایسے ہی ہر اس شخص کے لئے، جو مسلمانوں کے مسائل و معاملات میں مشغول رہتا ہو، اسکی اصل میں حضرت بلال رضی اللہ عنہ کا عمل پیش کیا جا سکتا ہے، جو متعدد طرق سے مروی ہے کہ وہ اذان و اقامت کے درمیان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دروازے پر حاضر ہوتے، اور آپ کو نماز کی اطلاع دیتے، یہ قول امام ابو یوسف علیہ الرحمہ کا ہے۔

تیسرا قول متاخرین علماء کا ہے، وہ مغرب کے علاوہ ہر نماز کے لئے تثویب کو مستحسن قرار دیتے ہیں، اور اس کی علت یہ بیان کرتے ہیں کہ ہمارے زمانے میں نماز وغیرہ میں سستی اور غفلت ہونے لگی ہے، اس لئے اذان کے بعد دوبارہ اطلاع کر دینی مناسب ہے، دور اول میں یہ غفلت نہ تھی، اس لئے اس زمانے میں اسکی ضرورت نہ تھی، مذکورہ بالا دونوں اثر پر عمل نہ کرنے کا یہی عذر ہے۔ بشرطیکہ انھیں ان دونوں اثروں کی اطلاع رہی ہو تاہم اس میں کلام کی گنجائش ہے، میں نے (مولانا عبد الحی صاحب نے) اس موضوع پر ایک مستقل رسالہ لکھا ہے جس میں اس کی کافی تحقیق کر دی ہے، اسکا نام (التحقیق العجیب فی التثویب) ہے۔

دوسری مثال

ایک اور روایت ملاحظہ ہو، اسے امام ترمذی نے نقل کر کے اسے حسن قرار دیا ہے۔ ان کے علاوہ امام نسائی، ابن ماجہ اور بیہقی وغیرہ نے بھی ذکر کیا ہے کہ حضرت عبد اللہ بن مغفل کے بیٹے نماز میں بسم اللہ الرحمٰن الرحیم جہراً پڑھ رہے تھے، اسے حضرت عبد اللہ بن مغفل نے سنا تو فرمایا کہ میرے بیٹے! یہ نئی بات ہے۔ نئی بات سے بچو میں نے اصحاب رسول اللہ ﷺ میں ہر شخص کو دیکھا ہے کہ اسلام میں نئی چیز سے زیادہ کوئی بات ان کے نزدیک مبغوض نہ تھی، انھوں نے فرمایا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نماز پڑھی ہے، پھر ابو بکرؓ اور عمرؓ اور عثمانؓ کے ساتھ پڑھی ہے، ان میں سے کسی کو نماز میں میں نے بسم اللہ پڑھتے نہیں سنا ہے، اس لئے تم بھی نہ پڑھو، جب نماز پڑھو تو اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ کہو۔

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ نماز میں جہراً بسم اللہ پڑھنا نئی چیز ہے، جسے عبد اللہ بن مغفل نے برا سمجھا ان کے نزدیک ایسا ہی ثابت ہے، تاہم یہ مسئلہ ائمہ کے درمیان اختلافی ہے، اور حدیثیں اس باب میں متعارض ہیں۔ اور حق بات یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے کبھی کبھی جہر ثابت ہے، لیکن سراً پڑھنا زیادہ قوی ہے اس مسئلہ پر میں نے اپنے رسالہ احکام القنطرة فی احکام البسمله میں بحث کی ہے۔

دوسری قسم کی مثال

تراویح کی نماز کو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بدعت کہا، لیکن اس کے

لئے عمدگی کا وصف ثابت کیا، سنن سعید بن منصور میں حضرت ابو امامہ باہلی رضی اللہ عنہ کا ارشاد نقل کیا گیا ہے۔ انھوں نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے تم پر رمضان کا روزہ تو فرض کیا ہے، لیکن رمضان کا قیام (یعنی تراویح کا ادا کرنا) نہیں فرض کیا۔ یہ ایک نئی چیز تم نے جاری کی ہے، اس لئے اس پر مداومت برتو، اسے چھوڑنا مت، بنی اسرائیل کے کچھ لوگوں نے اللہ کی رضا مندی کے لئے ایک نئی بات شروع کی، لیکن اسے وہ نباہ نہ سکے، تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان پر عتاب ہوا، پھر انھوں نے یہ آیت تلاوت کی وَرَهْبَانِيَّةَ نِ ابْتَدَعُوهَا الخ باوجود ابتداع کے انھوں نے اس پر مداومت کا حکم دیا۔ اس سے معلوم ہوا کہ یہ ایک بہتر چیز ہے۔

دوسری مثال

مصنف ابن ابی شیبہ میں صحیح سند سے منقول ہے کہ حکم بن اعرج نے حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے چاشت کی نماز کے بارے میں دریافت کیا تو انھوں نے فرمایا بدعة۔ نعمت البدعة هی بدعت ہے، لیکن اچھی بدعت ہے، اور مصنف عبد الرزاق میں صحیح سند سے حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کا قول منقول ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت تک یہ نماز کوئی نہیں پڑھتا تھا، اور لوگوں نے جو کچھ نئی بات نکالی ہے، میرے نزدیک اس سے زیادہ پسندیدہ اور کوئی چیز نہیں ہے۔

علامہ قسطلانی نے المواهب اللدنیه میں اس کی تشریح کرتے ہوئے لکھا ہے، اس قول سے ان کی مراد یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اس پر

مداومت نہیں کی ہے، یا یہ کہ اس کو مساجد میں علی الاعلان پڑھنے کو انھوں نے بدعت کہا ہے۔

حاصل یہ ہے کہ حضرت عبد اللہ ابن عمر رضی اللہ عنہ کی حدیثوں سے چاشت کی نماز کی مشروعیت منفی نہیں ہوتی، ان کی نفی ان کے دیکھنے پر محمول ہے، یعنی انھوں نے دیکھا نہیں تھا، کہ انھوں نے کسی خاص صفت کی نفی کی ہے۔ انتہی

احکام شرع میں صحابۂ کرام رض کی حیثیت

اب یہ سوال رہ جاتا ہے، صحابہ کی طرف سے دین میں اگر کوئی ایسی بات ظہور میں آئی، جو عہد رسالت میں نہیں تھی، اس کو آپ نے بتایا کہ وہ بدعت نہیں ہے۔ تو اس کے بدعت نہ ہونے کی کیا دلیل ہے؟

جواب یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بکثرت حدیثیں اس مضمون کی موجود ہیں کہ صحابہ کرام کی سیرت کی اقتداء اور پیروی کرنی چاہیئے۔

پہلی حدیث

ایک مشہور حدیث ہے۔ اصحابی کالنجوم بایهم اقتدیتم اهتدیتم میرے صحابہ ستاروں کے مانند ہیں۔ جس کی بھی پیروی کروگے، ہدایت پر رہوگے۔

اس حدیث کو امام دارقطنی نے الموتلف میں اور کتاب غرائب مالك میں، اور امام قضاعی نے مسند شهاب میں، اور عبد بن حمید نے، اور بیہقی نے المدخل میں اور ابن عدی نے کامل میں، اور داری اور ابن عبد البر، اور ابن عساکر اور حاکم وغیرہ نے مختلف الفاظ میں بیان کیا ہے، الفاظ

مختلف ہیں، معنی قریب قریب ہیں، اور طرق بھی متعدد ہیں گویا کہ سب طرق ضعیف ہیں، حافظ ابن حجر نے "الکافی الشاف فی تخریج احادیث الکشاف" میں اس کو تفصیل کے ساتھ لکھا ہے، لیکن طرق کی کثرت نے اسے حسن کے درجے تک پہنچا دیا ہے، اسی لئے علامہ حسن صنعانی نے اسے حسن قرار دیا ہے۔ چنانچہ سید شریف جرجانی نے مشکوٰۃ کے حاشیہ میں فضل العالم علی العابد والی حدیث کے تحت لکھا ہے کہ اصحابی کالنجوم میں صحابہ کو نجوم کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے۔ اس حدیث کو امام صنعانی نے حسن قرار دیا ہے۔

علامہ قاسم بن قطلو بغا نے شرح مختصر المنار میں لکھا ہے کہ صحابی کی تقلید واجب ہے۔ اس سے قیاس کو ترک کر دیا جائے گا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ مثل اصحابی فی امتی مثل النجوم بایھم اقتدیتم اھتدیتم، میرے صحابہ رض کی مثال ستاروں جیسی ہے، جس کی بھی اقتدا کرو گے، ہدایت پر رہو گے۔

امام دار قطنی اور امام ابن عبد البر نے حضرت ابن عمر سے اس کو روایت کیا ہے، اور اسی معنی کو حضرت انس سے بھی نقل کیا گیا ہے، اسکی ہر سند میں کلام ہے، لیکن ایک کو دوسرے سے تقویت ہوتی ہے۔

دوسری حدیث

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ علیکم بسنتی و سنة الخلفاء الراشدین۔ تم میری سنت کو لازم جانو، اور خلفاء راشدین کی سنت

کو، (ابو داؤد و ترمذی وغیرہ)

تیسری حدیث

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اقتدوا بالذین من بعدی ابی بکر و عمر۔ میرے بعد ابو بکر و عمر کی اقتدا کرو۔ (ترمذی۔ احمد وغیرہ)

حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کا ارشاد

حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کے قلوب پر نگاہ ڈالی، تو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا انتخاب کیا، اور انھیں رسول بنا کر بھیجا، پھر اپنے بندوں کے قلوب کو دیکھا، تو ان کے لئے کچھ اصحاب کا انتخاب کیا، انھیں اپنے دین کا مددگار اور اپنے نبی کا وزیر بنایا، پس جس کو مسلمان اچھا سمجھیں، وہ اللہ کے نزدیک بھی حسن ہے، اور جس کو مسلمان برا سمجھیں وہ اللہ کے نزدیک برا ہے۔ (بزار، طبرانی، احمد وغیرہ)

ان احادیث کو میں نے پوری تحقیق کے ساتھ تحفۃ الاخیار میں لکھا ہے۔

سوال

اگر صحابہ رضی اللہ عنہم کی طرف سے کوئی ایسی چیز وجود میں آئی جو دور نبوت میں نہ تھی، تو اب کس پر عمل کرنا بہتر ہے، جو صحابہ رضی اللہ عنہم نے کیا ہے، اس پر، یا جیسا عہد نبوت میں تھا، اس کے مطابق عمل کرنا چاہیئے۔

جواب

اس کے جواب میں تفصیل ہے۔

۱۔ صحابہؓ کے اس عمل کے مطابق کوئی نص قرآنی، یا کوئی حدیث مل جائے، جس سے ان کے عمل کی تائید ہوتی ہو۔

۲۔ یا اس کے مخالف کوئی نص مل جائے۔

۳۔ یا کوئی نص اس مسئلے میں نہ ملے، وہ موافق نہ مخالف۔

اگر کوئی موافق نص مل جائے، تب تو کوئی تردد نہیں ہے اس پر عمل کرنا بہتر ہے، کیونکہ اگرچہ وہ عمل عہد رسالت میں نہ تھا، لیکن دلیل شرعی کے تحت اس کا آجانا ظاہر ہو گیا ہے۔

اور اگر دوسری صورت ہے، یعنی اس عمل کے خلاف کوئی نص مل جائے تو حتی الامکان دونوں کے درمیان تطبیق کی صورت نکالی جائیگی، تاکہ صحابی کا وہ عمل دائرہ شریعت سے باہر نہ ثابت ہو، اور اگر ایسا کرنا ممکن نہ ہو تو صحابی کے قول و عمل کو اختیار نہیں کیا جائے گا۔

اور اگر تیسری صورت ہے کہ صحابی کا کوئی قول یا اس کا عمل ملا، مگر کتاب و سنت میں اسکے مخالف یا موافق کوئی نص نہیں ملی، تو اس وقت ان کی تقلید مناسب ہے، کیونکہ صحابہ کے اتباع کی متعدد حدیثیں بیان ہو چکی ہیں۔ لہٰذا اس کا انتظار نہیں کیا جائے گا کہ کوئی موافق دلیل مل جائے، تو اس پر عمل کیا جاوے، یہ بہت عمدہ قاعدہ ہے، اس سے بہت سی فروعات کا سلسلہ حل ہو جاتا ہے۔

سوال

اگر کسی امر محدث پر صحابہؓ کرام متفق ہوں، تب تو اس کو اختیار کرنا بہتر

ہے، لیکن اگر اس میں خود صحابہ کرام کا اختلاف ہو تب کیا کرنا چاہئے؟

جواب

تب اختیار ہوگا، جس صحابی کی پیروی کی جائے گی وہ ہدایت ہی کا راستہ ہوگا۔ چنانچہ اہل اصول نے اس کی تصریح کی ہے۔

دور تابعین و تبع تابعین کے امر محدث کا حکم

حضرات صحابہؓ کے بعد تابعین و تبع تابعین کے دور میں اگر کوئی نئی بات وجود میں آئی ہو، تو اسمیں بھی وہی تفصیل ہے، جو پہلے گزری، یعنی اگر ان کی طرف سے اس پر نکیر ہوئی ہو تو بدعت ہے، ورنہ نہیں۔

اور اگر کوئی چیز ان تینوں زمانوں کے بعد وجود میں آئی ہو، تو اسے دلائل شرع کی روشنی میں دیکھا جائے گا، اگر ان تینوں زمانوں میں اسکی نظیر موجود ہوگی، یا کسی قاعدہ شرعی کے تحت داخل ہوگی تو وہ بدعت نہیں ہے۔ کیونکہ اگرچہ اس کا وجود تینوں قرنوں میں نہیں ہے لیکن اسکے لئے شرعی اصل موجود ہے، تو اگر اس پر بدعت کا اطلاق ہوگا بھی تو حسنہ کی قید کے ساتھ، اور اگر اس کے حق میں کوئی اصل اور قاعدہ شرعی نہ پایا جائے، تو وہ بدعت ضلالہ ہے، اسکا ارتکاب کرنے والا خواہ ارباب فضیلت میں ہو، یا کوئی شیخ ہو، اسلئے علماء و مشائخ کا عمل جب تک شرع کے مطابق نہ ہو، حجت نہیں ہے۔

اس تفصیل کے بعد یہ بات اچھی طرح واضح ہوگئی کہ کُلُّ بِدْعَةٍ ضَلَالَةٌ کو جو بعض علماء نے عام مخصوص منہ البعض مانا ہے اور بعض نے عام غیر مخصوص مانا ہے، یہ نزاع اور اختلاف محض لفظی ہے، جس نے بدعت کا عام

لغوی معنی مراد لیا ہے، یعنی ہر وہ چیز جو عہد نبوی میں نہ پائی گئی ہو، اس نے بدعت کی کئی قسمیں بتائی ہیں بدعت واجبہ، بدعت مستحبہ، بدعت مباحہ، بدعت مکروہہ، بدعت محرمہ، اس بنیاد پر حدیث میں تخصیص کرنا اور ابتدائی تین قسموں کو اس سے خارج کرنا لازم ہے۔

اور جس نے اسکا شرعی معنی ملحوظ رکھا، یعنی وہ چیز جس کا وجود قرون ثلثہ میں نہ رہا ہو اور نہ اس کے لئے کوئی دلیل شرعی موجود ہو، اسنے حدیث کو عام رکھا، اسی لئے علامہ برکلی نے الطریقة المحمدیه میں لکھا ہے کہ اگر تم ان تمام امور کی جنھیں بدعت حسنہ کہا گیا ہے اور وہ عبادات کی جنس سے ہیں تحقیق کروگے تو ان سب کے لئے اشارۃً یا دلالۃً کوئی نہ کوئی دلیل شرعی پالوگے۔

اس سلسلے میں ہمارے زمانے کے علماء دو خرابیوں میں مبتلا ہیں۔

بعض تو وہ ہیں، جو سنت صرف اسے سمجھتے ہیں، جو پہلے تینوں عہدوں میں پایا گیا ہے، اور جو کچھ اس کے بعد وجود میں آیا، وہ بدعت ضلالت ہے، انھوں نے اس کا لحاظ نہیں کیا کہ وہ کسی شرعی دلیل کے تحت داخل ہے بلکہ بعض اہل تشدد نے تو اتنا غلو کیا کہ جو کچھ دور نبوت میں تھا۔ وہی سنت ہے، اور صحابہ کی باتوں کو بھی انھوں نے بدعت ضلالت ہی سمجھا۔

اور ایک جماعت وہ ہے، جس نے اپنے آباؤ اجداد کی ہر بات اور اپنے مشائخ کے ہر عمل پر اعتماد کیا، اور انھیں بدعت حسنہ میں داخل کرلیا۔ اور اس کا کوئی لحاظ نہیں کیا کہ کوئی دلیل شرعی اس کے حق میں ہے بھی یا نہیں؟

پھر جب پہلے گروہ نے کُلُّ بِدْعَةٍ ضَلَالَةٌ سے ان کے اعمال و اقوال

کی تردید کی، تو دوسرا گروہ حدیث کی تخصیص کے دامن میں پناہ لینے لگا، حق تعالیٰ ان جھگڑوں سے امت کو پاک کرے، یہ لڑنے والے سمجھتے ہیں کہ یہ جو کچھ وہ کر رہے ہیں مفید ہے۔ ہرگز نہیں۔ واللہ یہ سخت مضر ہے۔ کلام طویل ہوا جا رہا ہے، ورنہ میں دونوں فریق کی غلطیاں واضح کرتا کہ جس چیز کو ایک گروہ نے بدعت حسنہ قرار دے رکھا ہے، وہ حسنہ نہیں ہے، اور دوسرے گروہ نے جن جن چیزوں کو بدعت سیئہ بنا رکھا ہے۔ وہ سب سیئہ نہیں ہیں۔ میں افراط و تفریط سے الگ درمیانی راستہ اختیار کرتا[1]

سنت اور بدعت کی یہ پوری بحث اور تحقیق آپ نے پڑھ لی، اس میں بعض مقامات ایسے بھی ہیں، جن کی مزید تفصیل کی ضرورت ہے، مثلاً خلفاء راشدین کی سنت کا معاملہ ذرا اہم ہے، اس پر سیر حاصل بحث کے لئے ایک مستقل مقالہ کی ضرورت ہے اللہ نے توفیق دی تو اس کو مفصل لکھا جائے گا۔

اس بحث کو پھر پڑھئے، اور بار بار پڑھئے۔ اور پھر غور کیجئے کہ کثرت عبادت کو بدعت کہہ دینا، اور بڑے بڑے عابدین وزاہدین کو مرتکب بدعت شمار کرنا کس قدر دیدہ دلیری کی بات ہے۔ جس چیز کا تواتر و تسلسل ہم عہد نبوت سے پاتے ہیں اسکو بدعت کہنے کی ہمت وہی کر سکتا ہے، جو یا تو دین کے اصول وکلیات سے ناواقف ہو، یا جان بوجھ کر مسلمانوں کو دین کے تقدس اور اکابر علماء ومشائخ سے کاٹنا چاہتا ہو۔

صحابہ وتابعین اور انکے بعد کے لوگوں کا ذکر آپ نے پچھلے صفحات میں

---

[1] یہ پورا مضمون اقامۃ الحجۃ سے ص ۱۶ سے ص ۵۸ تک سے ماخوذ ہے۔

پڑھ لیا، اب ہم اس باب میں خود حضرت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت طیبہ کا مطالعہ کریں گے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شان عبادت

حق تو یہ تھا کہ اس عنوان کو سب سے پہلے لکھا جاتا۔ کیونکہ جو عمل اور طریقۂ عمل رسول اللہ ﷺ سے پایۂ ثبوت کو پہنچ جائے، اس پر کسی کو کسی اشکال کا حق نہیں رہ جاتا۔ اگر حقیقۃً رسول اللہ ﷺ سے عبادت کی کثرت ثابت ہو جائے، تو کسی کی مجال کیا ہے کہ اسے بدعت قرار دے لیکن چونکہ احادیث میں بکثرت عبادت کے زیادہ انہماک سے ممانعت وارد ہوئی ہے۔ اور بعض اوقات خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا عمل پیش کر کے عبادت میں میانہ روی کا حکم دیا ہے اسلئے سخن ناشناس لوگوں کو غلط فہمی ہوئی کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے مطلقاً عبادت کی تکثیر کو ممنوع قرار دیا ہے، اور جس چیز کو آپ ممنوع قرار دیں، اگر کوئی اس کا ارتکاب کرے تو اس کے خطا کار ہونے میں کیا تامل ہے؟ لیکن فی الحقیقت یہ غلط فہمی ہے، ہم یہاں دونوں طرح کی حدیثوں پر غور کریں گے، ان پر بھی جو آپ کی کثرت عبادت کو ثابت کرتی ہیں، اور ان پر بھی جو کثرت عبادت سے ممانعت پر دلالت کرتی ہیں، اور پھر قرآن وسنت ہی کی روشنی میں دونوں کا تعارض رفع کرنے کی کوشش کریں گے، تا کہ راہ مستقیم واضح ہو جائے، نہ غلو وافراط رہے اور نہ تقصیر وتفریط رہے، ہر بات اپنے موقع پر منطبق ہو جائے، کیونکہ ہر بات کا ایک محل ہوتا ہے، اگر کسی بات کو بے محل دیکھا جائیگا، تو وہ قطعاً غلط معلوم ہوگی، اور اگر

اسکو اس کے محل پر رکھ کر دیکھئے تو وہی بالکل صحیح اور ضروری معلوم ہوگی۔ تاویل الاحادیث ایک بڑا فن ہے اور اللہ تعالیٰ کی نعمتوں میں سے ایک نعمت عظمیٰ ہے کہ ہر بات کے، بالخصوص نصوص قرآنی، احادیث نبوی اور اکابر علماء کے اقوال کے صحیح محل کو پہچانا جائے۔ ورنہ غلط فہمیوں اور نادانیوں کا انبار جمع ہو جائیگا۔

ہم نے ارادہ یہی کیا تھا کہ جن احادیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کثرت عبادت کے خلاف پیش کیا جا سکتا ہے، ان پر گفتگو آخر میں کریں گے، اسی مناسبت سے، ان احادیث کو بھی ساتھ ہی میں عرض کرنا مناسب معلوم ہوا، جو آپ کی عبادت کی شان کو واضح کرتی ہیں تاکہ دونوں رخ سامنے رہیں، اور گفتگو میں آسانی ہو۔

پہلی حدیث

عن عائشة رضی اللہ عنها قالت: كان النبی صلی اللہ علیه وسلم لیقوم لیصلی حتی ترم قدماه، فیقال له فیقول افلا اكون عبدا شكوراً (رواه البخاری)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اتنی طویل و مدید نماز پڑھتے تھے کہ آپ کے پاؤں ورم کر آتے تھے، اس سلسلہ میں آپ سے عرض کیا جاتا، تو آپ فرماتے کہ کیا میں شکر گزار بندہ نہ بنوں۔

دوسری حدیث

عن المغیرة قال: صلی رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم

حتیٰ انتفخت قدماہ فقیل لہ اتتکلف ھذا وقد غفر لك ما تقدم من ذنبك وما تاخر؟ قال افلا اکون عبداً شکوراً (رواہ الترمذی[۱])

حضرت مغیرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، انھوں نے فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اتنی نمازیں پڑھیں کہ آپ کے پائے مبارک پھول گئے، آپ سے عرض کیا گیا کہ آپ اتنی تکلیف کیوں اٹھاتے ہیں؟ آپ تو بخشے بخشائے ہیں، فرمایا تو کیا میں شکرگزار بندہ نہ بنوں۔

تیسری حدیث

اسی مضمون کی روایت حضرت مغیرہ رضی اللہ عنہ ہی سے ابن ماجہ اور نسائی شریف میں بھی منقول ہے جس میں حتی تورمت قدماہ کے الفاظ ہیں، یعنی آپ کے قدموں پر ورم آگیا۔

چوتھی حدیث

عن ابی ھریرۃ رضی اللّٰہ عنہ کان رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم یصلی حتی تزلع قدماہ، حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ اتنی نماز پڑھتے تھے کہ آپ کے پائے مبارک پھٹ پھٹ جاتے تھے۔ (رواہ النسائی)

ان احادیث سے اندازہ کیجیے کہ رسول اللہ ﷺ کی عبادت کی کیا شان تھی۔ اللہ کے نبی جسم کے کمزور نہ تھے، حق تعالیٰ نے بہت طاقت وقوت سے

---

[۱] بخاری شریف میں بھی اس مضمون کی متعدد روایتیں ہیں۔

نوازا تھا۔ جہاں بڑے بڑے طاقتور عاجز رہ جاتے تھے، وہاں بھی آپ کی طاقت برقرار رہتی تھی، اتنا طاقتور انسان، نماز میں کھڑا ہوتا ہے، تو اس کے پاؤں ورم کر جاتے ہیں، صرف ورم ہی نہیں، حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی شہادت کے مطابق تو پائے مبارک کی کھال شق ہو جاتی تھی، اندازہ کیجئے کہ یہ احادیث کس قدر شدید مجاہدہ پر دلالت کرتی ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ آپ کی راتیں بکثرت عبادت میں گزری ہیں۔

علامہ قسطلانی نے مواہب لدنّیہ میں لکھا ہے کہ ابن بطال کا ارشاد ہے کہ ان احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ آدمی اپنے اوپر عبادت میں شدت اختیار کر سکتا ہے۔ اگرچہ اس سے اس کے بدن کو ضرر پہنچ جائے۔ دیکھئے رسول اللہ ﷺ کو معلوم تھا کہ ان کے اوپر کوئی خطا اور مواخذہ نہیں ہے۔ لیکن اس کے باوجود جب اتنی محنت و کاوش کرتے ہیں تو جن کو کچھ معلوم نہیں ان کو کیا کچھ کرنا چاہیئے۔ اور جس کو عذاب جہنم کا اندیشہ ہو، اس کے سلسلہ میں تو کچھ کہنا ہی نہیں ہے تاہم اس جیسی عبادت کا محل۔ جیسا کہ حافظ ابن حجر کا ارشاد ہے۔ یہ ہے کہ اس سے طبیعت میں اکتاہٹ نہ پیدا ہو، نبی کریم ﷺ کو عبادت کا درجۂ کمال حاصل تھا، آپ کے حق میں تو اکتاہٹ کا سوال ہی نہیں تھا، خواہ آپ کے جسم کو کیسا ہی ضرر پہنچ جائے، بلکہ آپ کا تو ارشاد ہے۔ اور صحیح روایت سے ثابت ہے کہ جعلت قرة عینی فی الصلوة (نسائی) میری آنکھوں کی ٹھنڈک نماز میں رکھدی گئی ہے، لہٰذا اگر کسی کو عبادت سے اکتاہٹ اور ملال محسوس ہونے لگے، تو وہ اپنے آپ کو مشقت میں نہ ڈالے، (انتہیٰ)۔

سوال

یہاں حدیثوں کا مطالعہ کرنے والے ایک سوال کر سکتے ہیں، وہ یہ کہ احادیث سے صراحۃً معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے کبھی پوری رات نماز نہیں پڑھی ہے، اور نہ کبھی ایک رکعت میں پورا قرآن پڑھا ہے، بلکہ آپ نے تو تہجد کی نماز کبھی گیارہ رکعت سے زیادہ نہیں پڑھی ہے۔

اس کی دلیل یہ ہے کہ ابو داؤد شریف میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے وہ فرماتی ہیں کہ

لم يقم رسول الله صلى الله عليه وسلم ليلة يتمها حتى الصباح ولم يقرأ القرآن فى ليلة قط ولم يصم شهرا يتمه غير رمضان وكان اذا صلى صلوٰة داوم عليها۔

رسول اللہ ﷺ نے پوری رات صبح تک نماز نہیں پڑھی ہے، اور نہ ایک رات میں قرآن پڑھا ہے، اور نہ مسلسل ایک ماہ روزہ رکھا۔ بجز رمضان کے اور جب کسی نماز کو اختیار کرتے تھے تو اس پر دوام کا اہتمام کرتے تھے۔

اس مضمون کی روایت سنن دارمی اور مسلم شریف میں بھی ہے، مسلم شریف میں یہ الفاظ ہیں۔ ولا اعلم نبی اللہ قرأ القرآن کلہ فی لیلۃ ولا صلی لیلۃ الی الصبح ولا صام شهرا کاملا غیر رمضان۔ میں نہیں جانتی کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک رات میں پورا قرآن پڑھا ہو اور صبح تک پوری رات نماز پڑھی ہو، اور رمضان کے علاوہ پورے مہینہ کا روزہ رکھا ہو،

مسلم شریف کی ایک روایت میں ما رایتہ کا لفظ ہے، یعنی حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ میں نے نہیں دیکھا کہ آپ نے پوری صبح تک نماز پڑھی ہو اور ابن ماجہ کے الفاظ یہ ہیں لااعلم نبی اللّٰہ قرأ القرآن کلہ حتی الصباح۔ میں نہیں جانتی کہ اللہ کے نبی نے صبح تک پورا قرآن پڑھا ہو۔

اور بخاری شریف میں روایت ہے اور یہ روایت بھی حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا ہی سے ہے، وہ فرماتی ہیں کہ ماکان یزید رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم لا فی رمضان ولا فی غیرہ علی احدی عشرۃ رکعۃ۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم رمضان میں بھی اور رمضان کے علاوہ میں بھی گیارہ رکعت سے زیادہ نہیں پڑھتے تھے (آٹھ رکعت تہجد اور تین رکعت وتر)

ان تمام روایتوں کو پیش نظر رکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ گیارہ رکعت سے زیادہ پڑھنا، اور پوری رات نماز میں لگے رہنا، اور ایک رات اور دن میں قرآن ختم کرنا بدعت ہے۔

جواب

یہ تو آپ نے چند روایتیں دیکھیں، اگر صرف اتنی ہی اور یہی روایتیں ہوتیں اور ان کے علاوہ کوئی اور روایت نہ ہوتی تو بے شک یہ امور بدعت قرار پاتے، مگر چند حدیثوں کے پڑھ لینے سے فیصلہ میں عجلت نہیں کرنی چاہیے۔ مزید تلاش و جستجو سے کام لینا چاہیے اور پھر اس پورے ذخیرۂ علم پر غور کرکے کوئی معتدل فیصلہ کرنا چاہیے۔ کچھ حدیثیں اور سنئے۔

امام مسلم اور امام ابو داؤد نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا ہی سے ایک روایت نقل کی ہے وہ فرماتی ہیں کہ کان النبی صلی اللّٰه علیه وسلم اذا دخل العشر الا واخر من رمضان احیی اللیل، وایقظ اهله وشد المئزر۔ جب رمضان کا آخری عشرہ آتا تھا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم رات بھر عبادت کرتے تھے، اور اپنے گھر والوں کو جگاتے تھے اور کمر کس لیتے تھے۔

امام نووی نے اس حدیث کے لفظ احیی اللیل کی شرح کی ہے کہ استغر قه بالسهر بالصلوة وغیرها۔ پوری رات جاگ کر نماز وغیرہ میں مشغول رہتے تھے، اور علامہ ابن اثیر جزری نے "نهایة غریب الحدیث" میں احیاء اللیل کا ترجمہ لکھا ہے السهر فیه بالعباده و ترك النوم، رات میں جاگ کر عبادت کرنا اور سونے سے اجتناب کرنا۔

مشہور امام حدیث عبد بن حمید نے ایک روایت نقل کی ہے، اور اس روایت کو ابن ابی الدنیا نے بھی کتاب التفکر میں، اور امام ابن حبان نے اپنی صحیح میں، اور ابن مردویہ اور ابن عساکر نے نیز اصبہانی نے کتاب الترغیب والترهیب میں حضرت عطا سے نقل کیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ:

> "میں نے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے ایک مرتبہ عرض کیا کہ آپ رسول اللہ ﷺ کی کوئی عجیب بات بتائیے،

جسے آپ نے دیکھا ہو؟ انھوں نے فرمایا کہ حضور کی کون سی بات عجیب نہ تھی، اچھا سنو! ایک شب آپ میرے پاس تشریف لائے، اور میرے ساتھ لیٹ بھی گئے، مگر پھر فرمایا کہ مجھے چھوڑ دو، میں اپنے رب کی عبادت کروں، آپ یہ کہہ کر اٹھ گئے، اور وضو کر کے نماز میں مشغول ہو گئے۔ اور روتے رہے حتیٰ کہ آپ کے آنسو آپ کے سینۂ مبارک پر بہنے لگے پھر آپ نے رکوع کیا، اس میں بھی روتے رہے، پھر سجدہ کیا اس میں بھی روتے رہے پھر سجدہ سے سر اٹھایا اور اب بھی آپ رو رہے تھے اور اسی طرح پوری رات مشغول رہے یہاں تک کہ صبح کے وقت بلال نے آ کر نماز کی اطلاع دی میں نے عرض کیا یا رسول اللہ، آپ کیوں روتے ہیں، اللہ تعالیٰ نے تو آپ کی اگلی پچھلی سب خطائیں معاف کر دی ہیں۔ فرمایا کہ تو کیا میں شکر گزار بندہ نہ بنوں۔ اور میں ایسا کیوں نہ کروں، جب کہ اسی رات میں میرے اوپر اللہ نے یہ آیتیں نازل فرمائی ہیں۔

اِنَّ فِیۡ خَلۡقِ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ وَاخۡتِلَافِ الَّیۡلِ وَالنَّهَارِ لَاٰ یَاتٍ لِّاُولِی الۡاَلۡبَابِ ۝ الخ

یہ دو طرح کی حدیثیں آپ کے سامنے ہیں۔ اس کے علاوہ قرآن کی بعض آیات کے ظاہری مفہوم بھی ہیں، مثلاً حق تعالیٰ کا ارشاد ہے۔ وَالَّذِیۡنَ

يَبِيْتُوْنَ لِرَبِّهِمْ سُجَّدًا وَّ قِيَامًا ۝[۱] اور (رحمٰن کے بندے) وہ ہیں جو رات کاٹتے ہیں اپنے رب کے آگے سجدہ میں اور کھڑے، یعنی رات کو جب غافل بندے نیند اور آرام کے مزے لوٹتے ہیں، یہ خدا کے آگے کھڑے اور سجدہ میں پڑے ہوئے گزارتے ہیں۔[۲] دوسری جگہ ارشاد ہے تَتَجَافٰى جُنُوْبُهُمْ عَنِ الْمَضَاجِعِ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ خَوْفًا وَّطَمَعًا وَّمِمَّا رَزَقْنَاهُمْ يُنْفِقُوْنَ ۝[۳] جدا رہتی ہیں انکی کروٹیں اپنے سونے کی جگہوں سے پکارتے ہیں اپنے رب کو ڈر سے اور لالچ سے اور ہمارا دیا ہوا کچھ خرچ کرتے ہیں۔

ان آیات کے ظاہر الفاظ کی دلالت یہ ہے کہ اللہ کے نیک بندوں کی پوری رات عبادت نماز، اور دعائیں گزرتی ہے اس سے معلوم ہوا کہ پوری رات نماز پڑھنے، عبادت کرنے کی مدح خود حق تعالیٰ نے ارشاد فرمائی ہے۔

اس پر کوئی صاحب کہہ سکتے ہیں کہ ان آیات کا اطلاق اس صورت پر بھی صحیح ہے کہ آدمی پوری رات نہ جاگے، بلکہ رات میں بیدار ہو کر تہجد پڑھ لے، اس سے بھی وہ اس آیت کا مصداق ہو جائے گا، ہم کہیں گے کہ یہ صحیح ہے، لیکن ظاہر الفاظ سے تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ پوری رات جاگنے کی مدح کی گئی ہے، رات کے کسی قدر حصے میں جاگنا اور عبادت کرنا گو اس میں داخل ہے۔ لیکن تاویلاً اور مجازاً، یعنی بطور دلالت تضمن کے۔

ان حدیثوں اور آیات کے ظاہری مدلول کو پیش نظر رکھئے۔ اور پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس طرز عمل پر غور کیجئے، جس کا پچھلی احادیث میں ذکر

---

[۱] سورۃ الفرقان: ۶۴ [۲] فوائد عثمانی [۳] سورۂ سجدہ: ۱۶

آیا ہے کہ آپ نے نہ پوری رات جاگ کر نماز پڑھی ہے، اور نہ ایک رات میں قرآن ختم کیا ہے۔ بظاہر ان دونوں باتوں میں تعارض معلوم ہوتا ہے۔ حضور اکرم ﷺ کا دستور یہ تھا کہ قرآن کی تعلیم پر کامل طور سے عمل کرتے تھے، اسکا تقاضا یہ ہے کہ آپ نے پوری رات جاگ کر عبادت کی ہو، لیکن مذکورہ بالا روایات اس کی نفی کرتی ہیں۔ اس تعارض کو دور کرنا اہل علم کی ذمہ داری ہے۔ ہم نہیں جانتے کہ جو حضرات کثرت عبادت کو بدعت کہتے ہیں، وہ دونوں طرح کی حدیثوں میں تطبیق کی کیا صورت نکالیں گے۔ لیکن حضرت مولانا عبد الحی صاحب فرنگی محلی محدث قدس اللہ روحہ نے جو کچھ فرمایا ہے اسے ہم ذکر کرتے ہیں۔

تطبیق کی صورت

مولانا نے فرمایا کہ دونوں طرح کی یہ روایتیں الگ الگ احوال سے متعلق ہیں، جن روایتوں میں پوری رات کے قیام کی نفی ہے، ان کا تعلق عام احوال اور اکثر اوقات سے ہے، اور یہی بات گیارہ رکعت سے زائد کی نفی کے سلسلے میں بھی کہی جائے گی۔ کہ عام طور سے آپ پوری رات نماز نہیں پڑھتے تھے، بلکہ سوتے بھی تھے، اور نماز بھی پڑھتے تھے اور عموماً گیارہ رکعت پڑھتے تھے، عام حالات میں اس سے زیادہ نہیں پڑھتے تھے، ورنہ امام نووی نے مسلم شریف کی شرح میں لکھا ہے کہ آپ نے کبھی کبھی پندرہ رکعت تک بھی پڑھی ہے اور بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ رمضان میں آپ نے بغیر جماعت کے بیس رکعتیں بھی پڑھی ہیں، اس کی سند ضعیف ہے۔ اس حدیث پر مفصل گفتگو

میں نے "تحفة الاخیار" میں کی ہے۔

بہرحال اس سے یہ بات تو قطعی طور پر ثابت ہو جاتی ہے کہ عبادت کی کثرت کو بدعت کہنا درست نہیں ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ اگر یہ تسلیم بھی کرلیا جائے کہ رسول اللہ ﷺ نے نہ پوری رات نماز پڑھی ہے، نہ ایک رات میں قرآن پاک ختم کیا ہے، نہ گیارہ رکعت سے زیادہ تہجد کی نماز پڑھی ہے، جب بھی اتنا تو بہرحال ثابت ہے کہ آپ نے نماز میں اتنا طویل طویل قیام کیا ہے کہ آپ کے پائے مبارک ورم کر آئے تھے، یہ تو اگر بنظر غور دیکھا جائے تو مجاہدہ و انہاک کی انتہا ہے، اس مجاہدۂ شدیدہ کے ثابت ہو جانے کے بعد بھی کیا عبادت کی کثرت اور مجاہدوں کی شدت کو بدعت کہنا روا ہو سکتا ہے، بدعت کا مطلب تو یہ ہے کہ وہ یا اس کا مثل عہد نبوت میں نہ پایا جاتا ہو، عبادات کے مشروع ہونے کے لئے یہ شرط تو نہیں ہے کہ انکی ہر ہر جزئی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہو، اور اگر عبادت کی کوئی خاص صورت رسول اللہ ﷺ سے منقول نہ ہو، خواہ وہ کلیات کے تحت داخل ہو، اسے بہرحال بدعت ہی کہا جائے اگر عبادات کی مشروعیت میں اتنی تنگی اور تشدد سے کام لیا جائے گا تو امت کے لئے مشکلات پیدا ہو جائیں گی، حق یہ ہے کہ کسی عبادت کا ثبوت کلی طور پر حضور اکرم ﷺ سے مل جائے تو اس کی جزئیات اس مشروعیت کے دائرہ میں آ جائیں گی۔

تیسری بات یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے ارشادات مبارکہ اور آپ کے طرز عمل پر غور کرنے سے بداہۃً محسوس ہوتا ہے کہ آپ نے عبادت کے مجاہدوں

کو جو ترک کیا ہے اور دنیوی معاملات اور عبادات میں توازن اور اعتدال کی جو کیفیت برقرار رکھی ہے، وہ اس لئے نہیں ہے کہ کثرت عبادت کوئی ممنوع اور منکر شے ہے۔ آپ کی پوری زندگی، اور زندگی کا ہر ہر لمحہ شاہد ہے کہ آپ کو عبادت سے شدید شغف تھا۔ اور آپ کو اللہ تعالیٰ نے اس کی پوری قوت بھی عنایت فرمائی تھی، اور آپ کے سامنے اسکے فضائل ومحامد بھی عیاں تھے لیکن اس کے ساتھ آپ کو ہمیشہ یہ بھی خیال رہا کہ آپ اپنی امت کے لئے اسوہ اور نمونہ ہیں، امت کا ہر فرد آپ کی ذات اقدس میں اپنے عمل اپنے مزاج، اپنی طبیعت کے لئے رہنمائی تلاش کرے گا۔ اب تو ظاہر ہے کہ آپ کی امت میں جہاں قوی اور مضبوط ایمان والے ہیں۔ وہیں ضعیف اور کمزور ایمان والے بھی ہوں گے۔ جہاں بہت سے لوگ عبادت کا ذوق وشوق رکھتے ہوں گے، وہیں کچھ ایسے بھی ہونگے جو صرف فرائض وسنن پر اکتفا کرنا چاہیں گے۔ اس لئے آپ نے کثرت عبادت کی شدید خواہش کے باوجود پوری امت پر نگاہ شفقت ڈالتے ہوئے خود عبادات کے مجاہدات زیادہ نہیں کئے۔ اور گاہے گاہے اسکو کر کے دکھا بھی دیا تا کہ اسکے شائقین کے سامنے بھی نمونہ موجود رہے۔ اور یہ بھی ظاہر ہے کہ عام افراد امت کے مقابلے میں عبادت کے اندر مجاہدہ کرنے والوں کی تعداد کم ہی ہے۔ اس لئے اسکے نمونے بھی اسی لحاظ سے کم دکھائی دیتے ہیں، تاہم اگر آپ نے ان مجاہدات کو زیادہ نہیں اختیار کیا ہے، تو ان لوگوں سے تو یہ مجاہدات ثابت ہیں، جنکے اتباع کا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا ہے، یعنی خلفائے راشدین وصحابہ کرام رضی اللہ عنہم، ان حضرات

کے سلسلے میں تفصیلات گزر چکی ہیں۔

رہی یہ بات کہ آپ نے امت پر شفقت کے خیال سے کسی مشروع اور محبوب عمل کو ترک کیا ہے یا اسکی تقلیل کی ہے۔ اسکو حدیث پر نگاہ رکھنے والا ہر شخص جانتا ہے، ہم اسکی چند مثالیں پیش کریں گے۔

کثرت عبادت کے سلسلے میں، جو حدیثیں اور آثار مروی ہیں، ان پر مجموعی اعتبار سے نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ عبادت کی کثرت جس قدر بھی ہو مطلوب و محمود ہے، بلکہ خلقت انسانی کی یہی اصل غرض و غایت ہے، بذات خود اس میں کوئی خرابی یا قباحت نہیں ہے، قرآن کریم کی آیتیں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات اس پر صراحۃً دلالت کرتے ہیں، لیکن یہ بھی درست ہے کہ جابجا اس سے بتاکید ممانعت بھی آئی ہے، کبھی شخصی طور پر اور کبھی اجتماعی طور پر! اس ممانعت کی بنیاد یہ نہیں ہے کہ خدانخواسطہ عبادت کی کثرت کوئی بری چیز ہے، یا منشاء الٰہی کے خلاف کوئی حرکت ہے؟ اگر یہ بات ہوتی تو اس چیز پر قرآن و حدیث میں کوئی مدح نہ آتی اور نہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس میں ایسا انہماک رکھتے، جس کا مذکورہ سطور میں ذکر آیا۔ پھر ممانعت کی وجہ کیا ہے؟

بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو ایک محدود طاقت دے کر دنیا میں پیدا کیا ہے، اور پھر اسکو بھی طرح طرح کے عوارض مثلاً بیماری بھوک، پیاس، مصائب و آلام، جمود اور تکان سستی و کاہلی وغیرہ سے گھیر دیا ہے، اسکے علاوہ اسے جو ماحول اور معاشرہ ملا ہے، اس میں ماں باپ، اولاد اور دوسرے اعزہ و

اقربا پھر پڑوسی، مہمان مسافر وغیرہ کے بہت سے حقوق و واجبات متعلق کر دیئے ہیں۔ یہ ساری چیزیں آدمی سے وقت بھی چاہتی ہیں محنت بھی چاہتی ہیں، اور مال بھی! اور حق تعالیٰ نے اپنی شریعت میں ان تمام تقاضوں اور حاجتوں کی رعایت فرمائی ہے۔

پھر اسی کے ساتھ انسان کے دل کو جذبات شوق و محبت کا مورد و منبع بھی بنایا ہے، مختلف طبائع کے لحاظ سے آدمیوں کے دل میں مختلف چیزوں کا شوق و ذوق ہوتا ہے۔ اور یہ شوق عموماً لامحدود ہوتا ہے۔ جس چیز کا شوق انسان کو ہوتا ہے اس کی کسی حد پر پہنچ کر انسان کو تسلی نہیں ہوتی، ''یافت'' کے بعد ''نایافت'' کی جستجو آدمی کو ہر دم تڑپائے رکھتی ہے۔ اس شوق کو، جسے عشق سے بھی تعبیر کر سکتے ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات میں ملاحظہ فرمایئے۔

آپ فرماتے ہیں کہ:۔

لوکان لابن آدم وادیان من مال لا بتغی ثالثا ولا یملأ جوف ابن آدم الا التراب ویتوب اللہ علی من تاب (متفق علیہ[1])

اگر آدمی کے پاس مال سے بھری ہوئی دو وادیاں موجود ہوں، تو وہ تیسری کی جستجو میں رہے گا، آدم کے بیٹے کا پیٹ تو صرف (قبر کی) مٹی بھر سکتی ہے ہاں جو اللہ کی طرف رجوع کرتا ہے، اللہ تعالیٰ اس پر مہربانی فرماتے ہیں۔

یہ حال تو اس شوق کا ہے، جو محمود نہیں ہے، کہ دل میں ہوس گھس گئی، تو کسی طرح اس کی تکمیل نہیں ہو پاتی، یہی حال خیر و کمال کے شوق کا بھی ہے،

---

[1] مشکوۃ شریف باب الامل والحرص

اس سلسلے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک ارشاد ملاحظہ ہو فرمایا: -

لن یشبع المؤمن من خیر یسمعه حتی یکون منتهاه الجنة (رواه الترمذی[۱]) مومن خیر کی بات سننے سے کبھی سیر نہیں ہوتا یہاں تک کہ بالآخر وہ جنت میں جا پہنچتا ہے۔

اور تجربہ بھی شاہد ہے کہ شوق و رغبت کی کوئی حد نہیں ہے۔ آدمی کو اسکے شوق پر آزاد چھوڑ دیا جائے، تو وہ دوسرے تمام حقوق و حدود کو پامال کر دے گا، یا تھک ہار کر اور عاجز ہو کر بیٹھ رہے گا، کیونکہ جنون شوق میں دوسری چیزوں کی طرف سے صرف نظر کر دے گا، یا طاقت وقوت سے زیادہ کام کرنے کی وجہ سے بالآخر عاجز آجائے گا۔ یہ ایک ایسا انسانی تجربہ ہے، جس کا انکار دنیا کے اس سرے سے اس سرے تک کوئی نہیں کر سکتا۔

شریعت نے انسان کے شوق و رغبت اور دوسرے حقوق واجبہ کے درمیان توازن برقرار رکھنے کا حکم دیا ہے کہ کسی شوق میں نہ اتنا آگے بڑھو کہ دوسرے حقوق ضائع ہونے لگیں اور نہ اتنی کوشش اور محنت کرو کہ جسم اس سے تھک کر عاجز اور بے بس ہو جائے، اور جس کام کو تم کر سکتے ہو اس سے بھی رہ جاؤ۔

اس اصول کے مطابق غور کیجیے، تو نظر آئے گا کہ عبادت کے شوق و رغبت کے لحاظ سے آدمیوں کی تین قسمیں ہیں، بعض وہ ہیں، جن کو اسکا بے حد ذوق اور شوق ہے، کچھ وہ ہیں، جو اسکی طرف بجبر آتے ہیں، شوق ان میں کم ہوتا

---

[۱] مشکوٰۃ کتاب العلم

ہے، یا بالکل نہیں ہوتا، بہت سے ایسے افراد ہیں، جن میں اعتدال ہوتا ہے، نہ زیادہ شوق ہوتا، اور نہ بے شوقی ہوتی،

تیسری قسم کے لوگوں کے لئے بس عام ترغیب وترہیب کی ضرورت ہوتی ہے کہ ترغیب کی وجہ سے انکا شوق برقرار رہے، اور ترہیب کی وجہ سے طبعی سستی، جو عبادت کی راہ میں رکاوٹ بن سکتی ہے، زائل ہوتی رہے، اور دوسری قسم کے لئے ترہیب شدید وترغیب زائد کی ضرورت ہوگی، تاکہ عبادت سے انکی بے رغبتی زائل ہو اور ضروری عبادات کی جانب وہ مائل ہو، چنانچہ احادیث پر نظر رکھنے والوں کو اس کی مثالیں بکثرت ملیں گی۔

البتہ پہلی قسم کے لوگوں کو چونکہ عبادت کا میلان اور شوق زیادہ ہوتا ہے، اس لئے اندیشہ ہوتا ہے کہ عبادت میں انہماک کی وجہ سے کہیں وہ حقوق واجبہ میں تقصیر کے شکار نہ ہوجائیں، یا اپنے آپ کو شدت میں ڈال کر عبادت سے عاجز نہ ہوجائیں۔ اس بنیاد پر عبادت میں افراط سے انھیں روکا جاتا ہے، تاکہ توازن برقرار رہے۔ کثرت عبادت سے انھیں منع کرنیکی بنیاد یہ نہیں کہ وہ بذات خود کوئی منکر اور ناجائز چیز ہے، بلکہ دوسرے عوارض کی وجہ سے اسے منع کیا گیا ہے، اسی لئے اگر کسی کو عبادت کی کثرت کے ساتھ ساتھ حقوق کی ادائیگی کی طاقت ہو، اور وہ تھک ہار کر بیٹھ جانے والا نہ ہو تو اس کے لئے عبادت میں انہماک ممنوع نہیں ہے، اس تمہید کے بعد چند حدیثیں اور مولانا عبدالحی صاحب کا کلام ملاحظہ فرمائیں۔

طاقت کے بقدر عبادت کی اجازت

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہر شخص کو اسکی طاقت کے بقدر عبادت کی اجازت دی ہے، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے، وہ فرماتی ہیں کہ:۔

ان رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه وسلم اکلفوا من العمل ما تطیقون، فان اللّٰہ لا یمل حتی تملوا وان احب العمل الی اللّٰہ ادومه وان قل وکان اذا عمل عملا اثبته (ابو داؤد[1])

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ اتنا ہی عمل اختیار کرو، جس کی تمہیں طاقت ہو، کیونکہ اللہ تعالیٰ تو (اجر دینے سے) نہیں اکتائیں گے، تمہیں اکتا جاؤ گے، اللہ کے نزدیک پسندیدہ عمل وہ ہے، جس پر دوام ہو، گو کہ وہ کم ہو، اور آپ جب کوئی عمل کرتے، تو برابر کرتے۔

دوسری روایت ملاحظہ ہو۔ اسکی راوی بھی حضرت عائشہؓ ہیں اور یہ روایت بخاری شریف کی ہے۔

علیکم ما تطیقون فان اللّٰہ لا یمل حتی تملوا

جتنی تم کو طاقت ہو، اتنے ہی کو اپنے اوپر لازم کرو، اللہ تو نہیں اکتائیں گے تمہیں اکتا جاؤ گے۔

ایک روایت کے الفاظ یہ ہیں یہ روایت ابو نعیم نے حلیۃ الاولیاء میں عبدالرحمٰن بن مہدی کے تذکرہ میں نقل کی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ:

---

[1] اسی طرح کے الفاظ مسلم شریف میں بھی ہیں (شیخ ابو غدہ)

یتکلف احدکم من العمل ما یطیق فان اللہ لا یمل حتی تملوا و قاربوا و سددوا۔

ہر شخص وہی عمل اختیار کرے، جس کی اسے طاقت ہو، کیونکہ اللہ تعالیٰ نہیں اکتاتے، تمہیں اکتا جاؤ گے، حد اعتدال پر رہو،

جب اتنی بات ثابت ہوگئی کہ طاقت کے بقدر اتنا عمل کرنا درست ہے، جس سے سستی و ناکارگی نہ پیدا ہو جائے، تو اب گزارش یہ ہے کہ لوگوں کی طاقت کا حال یکساں نہیں ہے۔ بلکہ باہم بہت فرق ہے، ایک آدمی ایک کام کی طاقت نہیں رکھتا، اور دوسرا اسے نہایت آسانی سے کر ڈالتا ہے، کوئی آدمی ایک کام کرنے سے نہیں اکتاتا، اور دوسرا آدمی اس کے نام ہی سے اکتا جاتا ہے، بعض لوگوں کے پڑھنے لکھنے کی رفتار بہت تیز ہوتی ہے، جبکہ دوسرے لوگ اسکے قریب بھی نہیں پہنچ پاتے۔

(گزشتہ صفحات میں غالباً ذکر آچکا ہے کہ) سید ابو بکر بن احمد بن ابو بکر متوفی ۱۰۵۳ھ نے دس دن میں امام غزالی کی مبسوط تصنیف احیاء علوم الدین کا مطالعہ کر ڈالا، بسا اوقات وہ ضخیم جلدیں چوبیس (۲۴) گھنٹے میں پڑھ لیتے تھے، مجد الدین شیرازی صاحب قاموس نے صحیح مسلم تین دن میں پڑھی، علامہ قسطلانی نے بخاری شریف کو پانچ مجلسوں میں مزید تھوڑا سا وقت اور لگا کر پڑھ لیا تھا، حافظ ابو بکر خطیب نے صحیح بخاری صرف تین مجلسوں میں پڑھی۔

مشہور محدث حافظ ابن حجر نے سنن ابن ماجہ کو چار مجلسوں میں اور صحیح مسلم اور کتاب النسائی الکبیر کو دس مجلسوں میں پڑھا، ہر مجلس صرف چار گھنٹے کی ہوتی

تھی، معجم طبرانی صغیر ظہر سے عصر کے مابین صرف ایک مجلس میں پوری پڑھی۔[1]

(خلاصه الاثر فی اعیان القرن الحادی عشر)

شیخ عبد الوہاب شعرانی نے الیواقیت والجواہر میں لکھا ہے کہ انھوں نے فتوحات مکیہ کا جس کی دس ضخیم جلدیں ہیں۔ ایک دن میں دو دو مرتبہ مطالعہ کیا ہے، امام یافعی نے ایک عابد کے متعلق نقل کیا ہے کہ انھوں نے پورا قرآن اتنی دیر میں پورا کر لیا تھا، جتنی دیر میں جمعہ کا خطبہ پورا ہوتا ہے، اس طرح کی چیزیں وہ لوگ خوب جانتے ہیں جن کی نظر اسماء الرجال اور تذکروں کی کتابوں پر ہے [2]

اور اصل بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نفوس انسانی میں بھی عبادت و ریاضت کا ایسا ذوق و شوق پیدا کر دیتے ہیں کہ وہ فرشتوں کی مشابہت اختیار کر لیتے ہیں، جس طرح فرشتوں کو عبادت سے ایک لمحہ کے لئے اکتاہٹ نہیں ہوتی، اسی

---

[1] شیخ عبد الفتاح ابوغدہ فرماتے ہیں کہ مصنف خلاصۃ الاثر نے خطیب کی تاریخ کے حوالے سے یہ بھی لکھا ہے کہ اسماعیل بن احمد نیشاپوری نے بخاری شریف تین مجلسوں میں پڑھی ہے، مغرب سے فجر تک، پھر چاشت کے وقت سے مغرب تک، پھر مغرب سے فجر تک، اور یہ بھی بیان کیا ہے کہ حافظ عبدوسی نے استسقاء کے دور میں صرف ایک روز میں پوری بخاری شریف پڑھ لی تھی۔ ص ۱۱۶

[2] علامہ کفوی نے اعلام الاخیار میں قاضی القضاۃ نور الدین علی بن احمد طرسوسی کے حالات میں لکھا ہے کہ وہ قرآن بہت کم مدت میں پڑھ لیتے تھے، تراویح کی نماز میں انھوں نے پونے چار گھنٹے میں پورا قرآن پڑھ لیا تھا۔ اور یہ پڑھنا تنہائی میں نہ تھا، بڑے اکابر کے مجمع میں تھا، اس کو عبد القادر قرشی نے ذکر کیا ہے۔ (مولانا عبد الحیؒ صاحب)

نوٹ: شیخ عبد الفتاح فرماتے ہیں کہ نور الدین کے بجائے عماد الدین صحیح ہے، مولانا عبد الحیؒ صاحب نے الفوائد البہیہ ص ۱۱۷ میں یہی نام ذکر کیا ہے۔

طرح ایسے نفوس انسانی کو بھی نہیں ہوتی، جس شخص کو جس چیز کی لذت حاصل ہوجاتی ہے، اس کی کثرت اور انہماک سے وہ کبھی نہیں گھبراتا اور نہ کبھی اکتاتا ہے۔ اور جس کو لذت نہیں حاصل ہوتی، وہ بہت جلد اکتا جاتا ہے۔

امت محمدیہ کے ان علماء کا حال دیکھ لیجئے، جن کی تصانیف کی تعداد بہت ہے، مثلاً امام ذہبی، حافظ ابن حجر اور علامہ سیوطی وغیرہ، ان حضرات نے اپنی عمر کا ایک لمحہ بھی ضائع نہیں کیا ہے، اور کسی وقت مطالعہ اور تصنیف سے خالی نہیں بیٹھے، لیکن انہیں کبھی اکتاہٹ نہیں ہوئی، امام یافعی نے اپنے بارے میں لکھا ہے کہ بسا اوقات وہ پوری رات صبح تک کتابوں کے مطالعہ میں مشغول رہے، اور انہیں ذرا بھی سستی اور اکتاہٹ نہیں ہوئی۔

اس بندۂ ناتواں جامع اوراق (یعنی مولانا عبدالحئ صاحب فرنگی محلیؒ) کو مطالعہ اور تصنیف کی وہ لذت حاصل ہے کہ چند گھنٹوں میں ضخیم ضخیم جلدوں کا مطالعہ کرلیتا ہوں، اور بسا اوقات رات کو مغرب کے بعد سے تصنیف کے لئے بیٹھتا ہوں تو بجز نماز عشاء کے مسلسل بلا وقفہ آدھی رات تک لکھتا رہتا ہوں، اور ذرا بھی اکتاہٹ نہیں ہوتی۔ وللّٰہ الحمد علی ذلک۔

خلاصہ یہ ہے کہ نفوس کا حال طاقت وقوت میں مختلف ہے، جو شخص بغیر کسی اکتاہٹ اور تھکاوٹ کے کثرت عبادت، کثرت تلاوت اور تہجد کی نماز کو نباہ سکتا ہو، اس کے لئے سابقہ احادیث کی روشنی میں یہ بات بالکل درست ہے، ہاں جس کو تھکان، اکتاہٹ، اور کمزوری لاحق ہوجائے، یا کوئی اور خرابی پیدا ہونے لگے، اسے البتہ روکا جائے گا، بس یہ فیصلہ کردینا جتنا عمل رسول اللہ

صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا ہے، اس سے صورۃً زائد کرنا علی الاطلاق جائز نہیں ہے، کھلی ہوئی غلطی ہے۔

ایک اہم سوال

اس جگہ ذہنوں میں ایک سوال پیدا ہوسکتا ہے، اور بہت سے لوگ اس کو بڑی اہمیت سے پیش بھی کرتے ہیں، وہ یہ کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تمام انسانوں سے افضل اور بزرگ تر ہیں، اور آپ کی ذات ایک کامل ترین ذات ہے، اور جس قدر طاقت وقوت اللہ نے آپ کو بخشی تھی، وہ کسی اور کو نہ دی تھی، حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جو قوت حاصل تھی، وہ تم میں سے کس کو حاصل ہے؟ (ابوداؤد)

لیکن اس کے باوجود مذکورہ حضرات کی طرح آپ نے عبادت میں وہ کوشش واہتمام نہیں کیا۔ اس سے ثابت ہوا کہ یہ طریقۂ عمل آپ کے نزدیک پسندیدہ نہ تھا۔

مولانا فرماتے ہیں کہ یہ تسلیم ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بقدر کسی کو طاقت وقوت حاصل نہ تھی، لیکن معلوم ہونا چاہئے کہ آپ کا معاملہ تنہا آپ کی ذات کا نہ تھا، آپ پوری امت کے لئے قیامت تک آنے والی امت کے لئے پیشوا اور مقتداء بلکہ نمونہ تھے، آپ نے کثرت عبادت کو اس لئے ترک نہیں کیا ہے کہ خدانخواستہ وہ کوئی ناپسندیدہ چیز ہے، بلکہ آپ نے ایسا بربنائے شفقت ورحمت کیا ہے، کیونکہ آپ کا اتباع امت کے لئے لازم ہے، تو اگر آپ عبادات میں اپنی طاقت وقوت اور ذوق وشوق کے بقدر کوشش

کرتے تو، امت تنگی میں پڑ جاتی، ہم نے یہ جو توجیہ کی ہے، اپنی طرف سے نہیں کی ہے، بلکہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے ایک ارشاد سے ماخوذ ہے وہ فرماتی ہیں کہ:

ان كان رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم ليدع العمل وهو يحب ان يعمل به خشية ان يعمل به الناس فيفرض عليهم (بخاری وابوداؤد)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بعض کاموں کو پسند فرماتے تھے، اور چاہتے تھے کہ انہیں عمل میں لائیں، لیکن صرف اس لئے چھوڑ دیتے تھے کہ آپ کے اتباع میں لوگ بھی کرنے لگیں گے، تو وہ عمل ان پر فرض ہو جائے گا۔

یہی وجہ تھی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے رمضان کی چند راتوں میں تراویح جماعت کے ساتھ پڑھی، پھر صرف اس لئے چھوڑ دی کہ کہیں لوگوں پر فرض نہ ہو جائے، چنانچہ بخاری وغیرہ میں یہ بات مذکور ہے، اور ابو داؤد میں ایک روایت حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے منقول ہے کہ:۔

بال رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم فقام عمر فقال هذا ماء تتوضأ به قال، ما امرت كلما بلت ان اتوضأ الخ۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پیشاب کیا، حضرت عمر رضی اللہ عنہ آپ کے پیچھے پانی لیکر کھڑے ہو گئے۔ آپ نے فرمایا کہ عمر! یہ کیا ہے، انھوں نے عرض کیا، پانی ہے، آپ اس سے وضو کریں گے۔ فرمایا کہ مجھے یہ حکم نہیں دیا گیا ہے کہ جب میں پیشاب کروں تو وضو کروں، اور اگر میں ایسا کرتا تو یہ عمل سنت

قرار پاتا۔

اس طرح کی روایات بکثرت ہیں۔

خاکسار راقم السطور عرض کرتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی کام کو ترک کیا ہو، تو یہ اس بات کی دلیل ہرگز نہیں ہے کہ وہ کام ناجائز ہے یا ناپسندیدہ ہے، آپ کے ترک کی کئی وجہیں ہو سکتی ہیں۔ پھر جب تک اس سے ثابت نہ ہو، اسے حرام نہیں کہا جا سکتا ہے، جو لوگ محض آپ کے ترک کو دیکھ کر بدعت کا فتویٰ دینے لگتے ہیں، وہ حدود سے تجاوز کا ارتکاب کرتے ہیں۔

(اقامۃ الحجہ از صفحہ ۱۱۴ تا ۱۱۹)

کثرت عبادت سے ممانعت کی حدیثیں اور ان کا مطلب

اب ہم ان حدیثوں پر ایک نگاہ ڈال لینا ضروری سمجھتے ہیں، جن کو کثرت عبادت کی ممانعت میں پیش کیا جاتا ہے، حضرت مولانا عبدالحئی صاحب فرنگی محلی علیہ الرحمہ تحریر فرماتے ہیں کہ:

واقعہ یہ ہے کہ بعض حدیثیں کثرت وانہماک عبادت سے ممانعت کے سلسلے میں وارد ہیں، اور انہیں کو پیش نظر رکھ کر گمان کرنے والوں کو خیال ہوا ہے کہ یہ چیز مطلقاً ممنوع ہے، لیکن انہوں نے اچھی طرح غور نہیں کیا کہ یہ نہی کس موقع پر آئی ہے۔ اور کون سی جگہیں ہیں، جن میں نہی وارد نہیں ہے۔ ہم ان حدیثوں کو یہاں ذکر کرتے ہیں۔

یہ کل پانچ حدیثیں ہیں، جو مختلف طرق، اور مختلف الفاظ میں حدیث کی

متعدد کتابوں میں ذکر کی گئی ہیں۔

پہلی حدیث

پہلی حدیث حضرت حولاء اسدیہ رضی اللہ عنہا کے متعلق ہے، یہ روایت بخاری، مسلم اور نسائی میں کہیں نام کے ساتھ اور کہیں بغیر نام کے آئی ہے، اس کا حاصل یہ ہے کہ:

حضرت حولاء بنت تویت اسدیہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے پاس تھیں اتنے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے، آپ نے دریافت فرمایا کہ یہ کون ہے؟ میں نے کہا کہ حولاء بنت تویت ہے، یہ رات کو نماز پڑھتی رہتی ہے، مطلقاً نہیں سوتی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اونہہ! تم صرف اتنا ہی عمل اختیار کرو، جس کی تم کو طاقت ہو، اللہ تعالیٰ تو نہیں اکتائیں گے تمہیں اکتا جاؤ گے۔

دوسری حدیث

یہ حدیث حضرت زینب بنت جحش ام المؤمنین رضی اللہ عنہا کے متعلق ہے، یہ روایت مسلم شریف، نسائی شریف اور ابوداؤد شریف میں منقول ہے اس میں ہے کہ:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مسجد میں تشریف لے گئے تو دیکھا کہ دوستونوں کے درمیان ایک رسی تنی ہوئی ہے، آپ نے پوچھا کہ یہ کیا ہے؟ لوگوں نے بتایا کہ حضرت زینب نماز پڑھتی رہتی ہیں، جب انہیں

سستی ہونے لگتی ہے، تو اسے پکڑ لیتی ہیں، آپ نے فرمایا کہ اسے کھول دو، جب تک تمہیں نشاط رہے، نماز پڑھا کرو اور جب سستی یا فتور کا احساس ہو تو بیٹھ جاؤ۔

تیسری حدیث

یہ حدیث مشہور صحابی حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ کے متعلق ہے، اور بہت مشہور ہے، بخاری، مسلم میں متعدد طرق سے مروی ہے اس کا حاصل یہ ہے کہ:

حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو میرے متعلق یہ خبر ملی کہ میں نے کہا ہے کہ میں رات بھر عبادت کروں گا، اور دن کو ہمیشہ روزہ رکھوں گا، جب تک زندہ رہوں گا، اس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ، کیا تم نے ایسی ایسی بات کہی ہے، میں نے عرض کیا، جی! میں نے کہی ہے، آپ نے فرمایا کہ تم سے یہ نہ ہو سکے گا، اس لئے روزہ بھی رکھو، اور افطار بھی کرو، اور سوؤ بھی اور نماز بھی پڑھو، ہر ماہ میں تین روزے رکھ لیا کرو، نیکی دس گنا ملا کرتی ہے، یہ روزہ ایسا ہے، جیسے ہمیشہ روزہ رکھا ہو، میں نے عرض کیا کہ مجھے اس سے زیادہ کی طاقت ہے، آپ نے فرمایا کہ ایک دن روزہ رکھو، دو دن افطار کرو، میں نے عرض کیا کہ اس سے زیادہ کی مجھے طاقت ہے، آپ نے فرمایا اچھا ایک دن روزہ رکھو اور ایک دن افطار کرو، یہ حضرت داؤد علیہ السلام کا روزہ ہے، اور یہی

روزہ کا سب سے معتدل طریقہ ہے، میں نے عرض کیا کہ میں اس سے بہتر کی طاقت رکھتا ہوں، آپ نے فرمایا کہ اس سے بہتر نہیں ہے۔

اور یہ بھی فرمایا کہ ہر ماہ میں ایک ختم قرآن مجید پڑھ لیا کرو، میں نے عرض کیا کہ اس سے زیادہ کی مجھے طاقت ہے، فرمایا کہ بیس دن میں ایک ختم کرلیا کرو، میں نے عرض کیا کہ اے اللہ کے نبی، میں اس سے بہتر کی طاقت رکھتا ہوں، فرمایا کہ دس دن میں پورا کرلیا کرو، میں نے کہا کہ اے اللہ کے نبی! میں اس سے زیادہ کی طاقت رکھتا ہوں، فرمایا کہ اچھا سات دن میں پورا کرلیا کرو، اور اس سے آگے نہ بڑھو، کیونکہ تمہاری بیوی کا تم پر حق ہے، تمہارے مہمان کا تم پر حق ہے اور تمہارے بدن کا تم پر حق ہے، حضرت عبداللہ فرماتے ہیں کہ میں نے اپنے اوپر شدت اختیار کی، تو میں سختی میں پڑ گیا، حضور نے فرمایا تھا کہ تمہیں کیا معلوم؟ شاید تمہاری عمر لمبی ہو، میں نے وہی عمل اختیار کیا، جو اللہ کے نبیؐ نے مجھ سے کہا تھا، اب میں بوڑھا ہوگیا ہوں تو میں سوچتا ہوں کہ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی عطا کی ہوئی رخصت قبول کرلیتا تو اچھا تھا۔

چوتھی حدیث

یہ حدیث حضرت ابو درداء رضی اللہ عنہ کے متعلق ہے، اسے ابونعیم نے حلیۃ الاولیاء میں نقل کیا ہے اس کا مضمون یہ ہے کہ:

”حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ، حضرت ابودرداء رضی اللہ عنہ کے

گھر تشریف لے گئے، وہاں ان کی بیوی کو دیکھا کہ میلی کچیلی پراگندہ بال اور پھٹے حال رہتی ہیں، انہوں نے پوچھا کہ یہ کیا بات ہے، بیوی نے بتایا کہ آپ کے دوست کو عورت سے کوئی رغبت نہیں ہے، وہ دنوں کو روزہ میں گزارتے ہیں، اور رات نماز میں بسر کرتے ہیں، اس پر وہ حضرت ابودرداء کی طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا کہ تمہاری بیوی کا تم پر حق ہے، نماز بھی پڑھو اور سوؤ بھی، روزہ بھی رکھو اور افطار بھی کرو، یہ بات جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو معلوم ہوئی، تو آپ نے فرمایا کہ سلمان کو علم بخشا گیا ہے۔"

پانچویں حدیث

یہ حدیث ان تین آدمیوں کے باب میں ہے، جنہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عبادت اور آپ کے اعمال کے متعلق آپ کی ازواج مطہرات سے سوال کیا تھا، یہ روایت بخاری میں بھی ہے اور مسلم میں بھی اور نسائی اور مسند احمد میں بھی ہے، یہ حدیث اس طرح ہے کہ:

> ازواج مطہرات کی خدمت میں تین آدمی [1] آئے، انہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عبادت کے متعلق تحقیق کرنی تھی، انہیں جب آپ کی عبادت کا حال بتایا گیا، تو اسے انہوں نے کم سمجھا، پھر انہوں نے

---

[1] علامہ عینی نے عمدۃ القاری میں لکھا ہے کہ سعید بن مسیب کی مرسل روایت میں عبدالرزاق کے واسطے سے، ان تینوں آدمیوں کے نام یہ ہیں، علی ابن ابی طالب، عبداللہ ابن عمرو بن عاص اور عثمان بن مظعون رضی اللہ عنہم (شیخ ابوغدہ)

کہا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ہمیں کیا نسبت؟ آپ کی اگلی پچھلی خطائیں سب معاف ہیں (اس لئے آپ کو زیادہ عبادت کی ضرورت نہیں ہے) پھر ایک صاحب نے کہا کہ میں پوری رات نماز پڑھا کروں گا، دوسرے صاحب بولے کہ میں ہمیشہ روزہ رکھوں گا، تیسرے نے کہا کہ میں عورتوں سے کنارہ کشی اختیار کرتا ہوں، میں سرے سے نکاح ہی نہ کروں گا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لے آئے، تو آپ نے دریافت فرمایا کہ تمہیں لوگوں نے ایسی ایسی بات کہی ہے، سنو! واللہ میں خدا سے زیادہ ڈرنے والا اور متقی ہوں، لیکن میں روزہ بھی رکھتا ہوں، اور نہیں بھی رکھتا، میں نماز بھی پڑھتا ہوں اور سوتا بھی ہوں، اور میں نکاح بھی کرتا ہوں، جو شخص میرے طریقے سے اعراض کرے، اس کا مجھ سے تعلق نہیں۔

ایک روایت میں کسی صاحب کا یہ قول بھی ہے کہ میں گوشت نہیں کھاؤں گا۔

چھٹی حدیث

یہ حدیث حضرت عثمان بن مظعون اور حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہما اور بعض دوسرے صحابہ کے بارے میں منقول ہے۔ اس کو امام ابوداؤد نے مراسیل میں اور ابن جریر نے تفسیر میں ذکر کیا ہے، لکھتے ہیں کہ:

"یَآ اَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَاتُحَرِّمُوْا طَیِّبَاتِ مَآ اَحَلَّ اللّٰهُ لَكُمْ

(اے ایمان والو! اللہ نے جو پاک چیزیں حلال کردی ہیں، انہیں تم

حرام مت کرو) یہ آیت حضرت عثمان بن مظعون اور ان کے اصحاب کے بارے میں نازل ہوئی ہے، انہوں نے اپنے اوپر بہت سی خواہشات اور عورتوں کو حرام کرلیا تھا، اور بعض نے تو یہ ارادہ کرلیا تھا کہ اپنے عضو تناسل ہی کو کاٹ ڈالیں۔"

اور دوسری روایت میں ہے کہ ان لوگوں نے ترک دنیا کا ارادہ کرلیا تھا، وہ عورتوں کو چھوڑنے اور رہبانیت اختیار کرلینے کا عزم کرچکے تھے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو معلوم ہوا تو آپ نے خطبہ دیا، اور انہیں سختی سے روکا، اور فرمایا کہ تم سے پہلے بہت سے لوگ اپنے اوپر اسی سختی کی وجہ سے ہلاک ہوچکے ہیں، انہوں نے اپنے اوپر سختی کی، تو اللہ نے ان پر سختی ڈال دی، انہیں کے بچے کھچے لوگ گرجا گھروں اور عبادت خانوں میں ہیں، تم لوگ اللہ کی عبادت کرو، اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرو، حج کرو، عمرہ کرو، اور استقامت اختیار کرو اللہ تعالیٰ تمہیں راہ مستقیم پر قائم رکھیں گے۔ انہیں لوگوں کے بارے میں مذکورہ بالا آیت اتری۔

علامہ ابن جریر نے اس روایت میں کچھ اور تفصیلات مشہور مفسر سدی کے حوالے سے بیان کی ہیں، انہیں بھی ملاحظہ کرلیجئے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے، ایک روز لوگوں کو کچھ وعظ و نصیحت فرمائی، کچھ انہیں اللہ کا خوف دلایا اس وعظ سے بعض صحابہ اتنا متاثر ہوئے کہ دس صحابہ نے جن میں حضرت عثمان بن مظعون اور

حضرت علی بھی تھے۔ آپس میں مشورہ کیا کہ عیسائیوں نے اپنے اوپر متعدد چیزیں حرام کرلی تھیں، ہم بھی گوشت اور روغن کو اپنے اوپر حرام کرلیں، بعض لوگوں نے سونے کو حرام کرلیا، بعض نے عورتوں کو حرام کرلیا۔ حضرت عثمان بن مظعون ان لوگوں میں تھے، جنہوں نے عورتوں کو حرام کرلیا تھا، وہ اپنی بیوی کے پاس کبھی جاتے ہی نہ تھے، ایک روز ان کی بیوی حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے پاس آئیں، حضرت عائشہؓ نے فرمایا کہ کیا بات ہے کہ تمہارا رنگ بدلا ہوا ہے، نہ کنگھی ہے، نہ خوشبو ہے، کہنے لگیں کہ خوشبو لگا کر اور کنگھی کر کے کیا کروں گی، میرے شوہر اتنی مدت سے نہ میرے پاس آتے ہیں، اور نہ میرا کپڑا ہٹایا ہے، وہ یہ بات سن کر ہنسنے لگیں، اتنے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آگئے، آپ نے پوچھا کہ کیا بات ہے؟ کیوں ہنس رہی ہو؟ انہوں نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ، یہ حولاء ہیں، میں نے ان سے ان کے بارے میں دریافت کیا، تو کہتی ہیں کہ اتنے اتنے دن سے ان کے شوہر نے ان کا کپڑا نہیں اٹھایا ہے، حضرت نے انہیں بلوا بھیجا، وہ آئے، تو ان سے کہا کہ عثمان! کیا بات ہے؟ انہوں نے عرض کیا کہ میں نے یہ کام چھوڑ رکھا ہے تاکہ عبادت کے لئے فارغ رہوں، اور پھر پوری بات پیش کی، حضرت عثمان نے یہ بھی ارادہ کیا تھا کہ اپنے عضو تناسل کو کاٹ ڈالیں، حضرت نے فرمایا کہ میں تمہیں اللہ کی قسم دیتا ہوں کہ اپنی بات سے رجوع کرلو، اور اپنی بیوی کے پاس جاؤ۔ انہوں

نے عرض کیا یا رسول اللہ! میں روزہ سے ہوں، فرمایا روزہ توڑ دو، انہوں نے روزہ توڑ دیا، اور اپنی بیوی کے پاس گئے، اس کے بعد حضرت حولاء پھر حضرت عائشہ کی خدمت میں حاضر ہوئیں، تو اب سرمہ، کنگھی اور خوشبو کے ساتھ آئیں، حضرت عائشہ ہنسنے لگیں اور پوچھا کہ کیا بات ہے؟ انہوں نے بتایا کہ کل وہ میرے پاس آئے تھے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ کیا بات ہے کہ کچھ لوگوں نے عورتوں کو، کھانے کو، اور سونے کو حرام کرلیا ہے، میں تو سوتا بھی ہوں، نماز بھی پڑھتا ہوں، افطار بھی کرتا ہوں، اور روزہ بھی رکھتا ہوں، عورتوں سے نکاح بھی کرتا ہوں، جو شخص میرے طریقے سے روگردانی کرے، اس کا مجھ سے تعلق نہیں، اسی سلسلے میں آیت لَا تُحَرِّمُوْا طَيِّبَاتِ مَآ اَحَلَّ اللّٰهُ لَكُمْ نازل ہوئی ہے۔ [۱]

ان روایات واحادیث سے معلوم ہوتا ہے عبادت میں تشدد اور طاعات میں زیادہ محنت وکاوش جائز نہیں ہے، اور اس کا ملت اسلام سے کوئی تعلق نہیں ہے، لہذا اسے بدعت ہی کہنا چاہئے۔ تو جن لوگوں نے کثرت عبادت کا ارتکاب کیا ہے، انہوں نے ایسا کام کیا ہے، جس کو اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے منع کیا ہے، اس لئے ان کے اس کام کا اعتبار نہیں ہے، اصل بات تو وہی ہے، جسے اللہ کے رسول فرمائیں۔

---

[۱] مصنف علامہ مولانا عبدالحیؒ صاحب نے ان روایات کو تفصیل کے ساتھ متعدد طرق سے نقل کیا ہے، ہم نے اختصار کے خیال سے صرف حوالوں اور نفس مضمون پر اکتفا کیا ہے۔

احادیث مذکورہ کے صحیح مطلب

مولانا عبدالحیٔ صاحب علیہ الرحمہ نے ہر ایک حدیث پر علیحدہ علیحدہ کلام کیا ہے۔ ہم اسی ترتیب کے ساتھ اسے ذکر کرتے ہیں۔

(۱) پہلی حدیث جو حضرت حولاء سے متعلق ہے، اس میں غور کیجئے، کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز کی کثرت سے منع کیا ہے؟ آپ نے یہ فرمایا ہے کہ خُذُوا مِنَ الْعَمَلِ مَاتُطِیقُوْنَ جتنی طاقت ہو، اتنا عمل اختیار کرو۔ اس میں تو بقدر طاقت عمل کو اختیار کرنے کی صراحۃً اجازت ہے، جس سے آدمی کے اندر اکتاہٹ اور سستی نہ پیدا ہوجائے اس سے تکثیر عبادت کی ممانعت ثابت کرنا معقول نہیں ہے۔

(۲) حضرت زینب رضی اللہ عنہا کے متعلق تو حدیث میں صراحت موجود ہے کہ وہ نماز پڑھتے پڑھتے بالکل تھک جاتی تھیں اور سستی اور اکتاہٹ پیدا ہوجاتی تھی، اسی سستی اور اکتاہٹ کو دور کرنے کے لئے انہوں نے رسی باندھ لی تھی تاکہ بجائے سونے کے اسی سے اپنی سستی دور کرلیں۔ آپ نے اس سے منع کیا، اس میں تو کوئی اختلاف نہیں ہے۔

(۳) حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ نے زندگی بھر کے لئے عہد کرلیا تھا کہ میں نہ رات کو سوؤں گا، اور نہ دن میں افطار کروں گا۔ لاقومن الیل ولاصومن النہار ماعشت (جب تک زندہ رہوں رات بھر نماز پڑھوں گا، اور دن میں روزہ رکھوں گا) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو

معلوم ہوگیا کہ اس قول وقرار کو نباہنا ان کے بس کا نہیں ہے، آخر بڑھاپا بھی آئے گا، تو آپ نے رخصت اور سہولت کا راستہ دکھایا، اور اس کی وجہ یہ بیان فرمائی کہ تمہارے نفس کا بھی تم پر حق ہے، تمہارے اہل کا بھی تم پر حق ہے، اور فرمایا کہ اگر تم یہ کرو گے تو تمہاری آنکھ کمزور ہوجائے، تمہارا جسم ضعیف ہوجائے، اس سے ثابت ہوا کہ عبادت میں اتنی کاوش وکوشش جس سے ملال خاطر اور سستی پیدا ہوجائے، یا کسی حق شرعی میں خلل واقع ہو ممنوع ہے، اس حدیث میں کثرت عبادت سے علی الاطلاق ممانعت نہیں ہے۔

اس حدیث میں یوں بھی غور کیجئے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص کو کثرت عبادت سے منع کررہے تھے، تو اس کا مطلب اگر یہ ہوتا کہ یہ بات مذموم اور گناہ ہے، تو وہ آگے ہرگز یہ نہ کہتے کہ انی اطیق افضل من ذالك میں اس سے بہتر کی طاقت رکھتا ہوں۔ وہ پہلی مرتبہ میں خاموش ہوجاتے، اس سے معلوم ہوا کہ وہ عبادت کے زیادہ ہونے کو ممنوع نہیں سمجھ رہے تھے، اسی لئے مزید کی اجازت مانگ رہے تھے، اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم آگے کی اجازت دے کر ان کے اس فہم کو مسلم رکھ رہے تھے اور پھر جب عبداللہ بن عمرو بوڑھے ہوگئے، تو فرماتے ہیں وددت ان قبلت رخصة رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم (مجھے تمنا ہورہی ہے کہ کاش میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دی ہوئی رخصت کو قبول کرلیتا) اس کا مطلب یہ ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کو وہ عزیمت نہیں رخصت اور سہولت

سمجھ رہے ہیں، لہذا جو کچھ وہ کر رہے تھے، وہ عزیمت کا عمل تھا، انہوں نے صرف اسی کو دین نہیں قرار دیا، جس کا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس وقت انہیں حکم دیا تھا۔ (بلکہ دوسرا پہلو بھی دین ہی کا تھا، ایک مشکل تھا، دوسرا آسان! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے آسان پہلو کو اختیار کرنے کی تاکید فرمائی۔ لیکن اس کا مطلب ہرگز یہ نہیں ہوسکتا ہے جو مشکل پہلو ہے، وہ دین سے خارج ہے، بلکہ اصل تو وہی ہے، مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے افراد واشخاص کے ضعف اور حالات کے تغیر وتبدل کو دیکھتے ہوئے سہولت کو اختیار کرنے کی تاکید فرمائی، تاکہ اس پر مداومت آسان ہو۔)

(۴) حضرت ابودرداء رضی اللہ عنہ کو حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ نے عبادت کے التزام سے جو منع کیا اس کی علت کثرت نہ تھی، بلکہ اس لئے منع کیا کہ اس سے حقوق واجبہ میں کوتاہی ہورہی تھی، اور حقوق واجبہ میں اگر نفل عبادت کی وجہ سے تقصیر ہونے لگ جائے، تو وہ یقیناً ممنوع ہے، لیکن مطلقاً ممنوع نہیں ہے۔

(۵) تین صحابہؓ والے قصہ میں غور کیجئے، ان حضرات نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی عبادات کو کم سمجھا، اور اس کی علت ان بزرگوں نے یہ سمجھی کہ آپ تو بخشے بخشائے ہیں، اسلئے آپ کو عبادت زیادہ کرنے کی ضرورت نہیں ہے، اس کے بعد ان لوگوں نے اپنے اوپر ایسی چیزیں واجب کرلیں، جنھیں اللہ نے واجب نہیں کیا تھا، اور آسان راہ چھوڑ کر

مشکل راستہ اختیار کیا، اسی واسطے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں تنبیہ فرمائی، اور سہولت کا راستہ انھیں سمجھایا، اور یہ بھی ارشاد فرمایا کہ من رغب عن سنتی جو میری سنت سے اس لئے اعراض کرے کہ وہ میرے طریقے کو بہتر نہیں سمجھتا۔ چنانچہ ان صحابہؓ نے یہی سمجھ کر اپنے لئے ایک دوسری راہ اختیار کی، اس پر آپ نے فرمایا کہ فلیس منی، یعنی وہ ان لوگوں میں سے نہیں ہے، جو میرے راستے پر چلتا ہو، اور میری سیرت کی پیروی کرتا ہو، اس میں اس بات کی کوئی دلیل نہیں ہے اگر کوئی شخص اپنی طاقت کے بقدر عبادت میں کاوش کرتا ہو، اور جس کو اللہ نے واجب نہیں کیا ہے، اس کو واجب نہ سمجھتا ہو، اور اپنی اختیار کردہ راہ کو، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تجویز کردہ راہ سے افضل نہ سمجھتا ہو، وہ بھی جائز نہیں ہے۔

(۶) حضرت عثمان بن مظعون رضی اللہ عنہ اور انکے رفقاء نے اپنے اوپر وہ چیزیں حرام کر لی تھیں، جنہیں اللہ نے حرام نہیں کیا تھا اور اپنے اوپر وہ چیزیں واجب کر لی تھیں، جن کو اللہ نے واجب نہیں کیا تھا، اس لئے انہیں اس سے منع کیا گیا، یہ بات نہ تھی کہ عبادت کی تکثیر اور اس میں انہاک کوئی امر نا مشروع ہے، ہاں عبادت کا التزام کہ شریعت میں نئی بات پیدا ہونے لگ جائے، وہ البتہ دائرۂ شریعت سے خارج ہے۔

(اقامۃ الحجۃ از ص ۱۲۰ تا ص ۱۳۸)

مترجم عرض کرتا ہے کہ ان جوابوں کو پچھلے مباحث کی روشنی میں پڑھئے، تو اس میں ذرا بھی شبہ باقی نہیں رہے گا کہ کثرت عبادت فی نفسہ محمود بلکہ مقصود ہے، مگر انسان چونکہ تعلقات کے بندھنوں میں گرفتار ہے، اس لئے اسے رُخصت عطا کی گئی ہے کہ کم ہی عبادت پر اکتفا کرے، اور یہ اللہ کا محض فضل ہے کہ عبادات کا ثواب کم از کم دس گنا بڑھا کر عبادت کی کمی کو پورا فرما دیتے ہیں۔ گویا حق تعالیٰ کے یہاں عبادت کثیرہ ہی مقبول ہے، اگر وہ قلیل ہوتی ہے تو حسن عبادت اور خلوص وللّٰہیت وغیرہ کے اعتبار سے اسے بڑھا کر قبول کرتے ہیں۔

معراج میں نمازیں جو فرض ہوئی تھیں، وہ پچاس تھیں، اب خیال کیجئے، جب پچاس نمازیں پڑھنی ہونگی، تو دن رات کا کتنا حصہ باقی رہے گا، ظاہر ہے کہ کُل نہیں تو بیشتر حصہ نماز ہی میں گزرے گا، بہت قلیل حصہ اس سے خالی ہوگا۔ پھر اللہ تعالیٰ نے اسے کم کرتے کرتے پانچ تک پہنچایا، لیکن اس کے ساتھ یہ بھی ارشاد فرمادیا کہ یا محمد انهن خمس صلوات كل يوم وليلة، لكل صلٰوة عشر فذلك خمسون صلوة (رواه مسلم [1])

اے محمدؐ یہ پانچ نمازیں ہیں، دن و رات میں، ہرایک نماز کے لئے دس گنا ہے، لہذا یہ پچاس ہی نمازیں ہیں۔ چنانچہ حق تعالیٰ کی طرف سے یہ بھی ارشاد ہوا تھا کہ امضيت فريضتي وخففت عن عبادي (بخاری و مسلم [2])

---

[1] مشکوٰۃ شریف باب فی المعراج [2] حوالہ سابق

میں نے اپنا فریضہ نافذ کیا، اور اپنے بندوں پر تخفیف کی، یعنی کم کو زیادہ بنا کر قبول کیا، کیا اس حدیث سے اشارہ نہیں ملتا کہ اصل حکم یہی ہے کہ دن رات کا کل حصہ ہی عبادت میں مصروف کر دیا جائے؟ یقیناً ملتا ہے مگر اسکے لئے فہم کی ضرورت ہے۔

کثرت عبادت کے مسئلہ پر علامہ برکلی نے "طريقه محمديه" میں سلف کے سخت مجاہدات، اور مذکورۃ الصدر روایات کے درمیان ظاہری تعارض کے سلسلے میں نفیس کلام کیا ہے وہ فرماتے ہیں کہ:

عبادات کی کثرت اور مجاہدات کی شدت سے احادیث میں جو روکا گیا ہے، اس کی دو وجہیں ہیں ایک لِمّی اور ایک اِنّی، لمی علت یہ ہے کہ اس سے جان کی ہلاکت کا اندیشہ ہے، یا اس کی وجہ سے دوسروں کے حقوق واجبہ فوت ہو جانے کا ڈر ہے، یا اس لئے ممنوع ہے کہ آدمی اکتا کر کہیں سرے سے عبادت ہی نہ چھوڑ بیٹھے، یا اس پر دوام نہ کر سکے، ان وجہوں سے شدت مجاہدہ و عبادت ممنوع ہے۔[1]

اور انی علت یہ ہے کہ ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سارے عالم کے لئے رحمت ہیں، اور اللہ کی جانب سے آپ کو مخصوص قوت حاصل ہے،

---

[1] لمّی اور انّی دو (۲) اصطلاحی الفاظ ہیں جو اہل منطق کے درمیان رائج ہیں۔ ان کے نزدیک یہ دلیل کی دو (۲) قسمیں ہیں، برہان لمی کا مطلب یہ ہے کہ مؤثر سے اثر اور اصل سے فرع پر استدلال کیا جائے۔ جیسے لکڑی جلی اسلئے دھواں اٹھا اور برہان انّی کا مطلب یہ ہے کہ اثر سے مؤثر اور فرع سے اصل کی طرف استدلال کیا جائے جیسے دھواں دیکھ کر استدلال کیا جائے کہ آگ جل رہی ہے، بدن گرم ہے اسلئے بخار ہے وغیرہ۔

انہیں عبادت وریاضت کی وہ قوت حاصل ہے، جو دوسرے کسی امتی کو حاصل نہیں، اور اس کے ساتھ وہ خشیت وتقویٰ اور معرفت میں بھی سب سے فائق ہیں، آپ کے متعلق سوچا بھی نہیں جاسکتا کہ آپ نے کسی عمل خیر کے بتانے میں بخل کیا ہوگا۔ یا امت کی خیر خواہی میں کوئی کوتاہی روا رکھی ہوگی، نہ یہ خیال کیا جاسکتا کہ خدانخواستہ آپ نے عبادت میں سستی اور سہل انگاری سے کام لیا ہوگا، یا شاید آپ کو معلوم ہی نہ رہا ہو، ان میں سے آپ کے حق میں کوئی بات تصور میں بھی نہیں لائی جاسکتی، اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ جس طریقۂ عمل پر آپ کاربند تھے، اور اس کی ترغیب دی ہے، اگر عبادت اور قرب کا کوئی اور طریقہ اس سے بہتر اور نافع ہوتا، تو آپ ضرور اسے عمل میں لاتے، اسے بیان کرتے اور اس کی ترغیب دیتے، لہذا یہ یقینی بات ہے آپ ہی کا طریقہ افضل ہے اور خدا کی معرفت حاصل کرنے کا اقرب ترین راستہ ہے۔

پھر پرانے بزرگوں نے جو مجاہدات کئے ہیں، انہوں نے معالجۂ قلب کے لئے ایسا کیا ہے، یعنی اس لئے تاکہ وہ روحانی امراض سے شفا پائیں، یا اس لئے ایسا ہوا کہ عبادت ان کے لئے عادت اور طبیعت بن گئی تھی، جیسے تندرست آدمی کے لئے غذا، اس سے انہیں لذت وحلاوت حاصل ہوتی تھی، نہ وہ کسی کا حق ضائع کرتے تھے، نہ مداومت میں خلل پڑتا تھا، اور نہ وہ یہ سمجھتے تھے کہ یہ طریقہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقۂ عبادت سے کچھ بہتر ہے۔

اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کثرت وشدت کی حاجت نہ تھی، کیونکہ آپ کمالات کے انتہائی مراتب پر فائز تھے، انہیں اللہ کی طرف متوجہ رہنے سے کوئی چیز مانع نہ ہوتی تھی، نہ مخلوق سے گفتگو، نہ کھانا پینا، نہ سونا، نہ ازواج سے تعلق، غرض کوئی چیز توجہ الی اللہ سے مانع نہ تھی، آپ کے لئے خلوت وجلوت برابر تھی، اس لئے آپ نے ان ظاہری عبادات پر اکتفا فرمادیا تھا، جو آپ کے لئے اور آپ کی امت کے لئے افضل ترین تھیں، اور اللہ کی حضوری کی لذت وحلاوت آپ کے حق میں دائم تھی، اس کے لئے کسی خاص عبادت کی تخصیص نہ تھی۔

بعض مشائخ جو قرب کے بلند درجات پر پہنچ گئے، اور اس کی وجہ سے انہوں نے ظاہری عبادات میں تقلیل کردی تھی ان سے منقول ہے، وہ فرماتے ہیں کہ من رآنی الآن صار زندیقا ومن رآنی قبل صار صدیقاً، جس نے اس وقت مجھے دیکھا، وہ زندیق ہوگیا، اور جس نے اب سے پہلے مجھے دیکھا، وہ صدیق ہوگیا۔

انہوں نے یہ بات اس لئے فرمائی کہ آخر میں وہ ظاہری عبادات میں محض فرائض وواجبات اور سنن پر اکتفا کرنے لگے تھے، اور عام لوگوں کی طرح کھاتے پیتے اور سوتے تھے، اور اپنے ابتدائی عہد میں مجاہدات وریاضت کیا کرتے تھے، تو جس نے انہیں دور اخیر میں دیکھا، وہ مجاہدات وریاضت سے نابلد رہا، اور کوئی مقام حاصل نہ کرسکا، بلکہ ان کا منکر ہوا، جس کی وجہ سے اس پر کفر کا اندیشہ ہے۔

پس سلف سے مجاہدات کی جو شدت منقول ہے، اس کی وجہ یہی دو ہو سکتی ہیں، یعنی معالجۂ قلب یا عبادت کا عادت وطبیعت بن جانا، یہی محمل صحیح اور حق صریح ہے، لہذا افراط وتفریط میں نہ مبتلا ہوں، بلکہ ان دونوں کے درمیاں کا راستہ اختیار کرو۔ (علامہ برکلی کا کلام پورا ہوا)

اور طریقۂ محمدیہ کی شرح الحدیقة الندیه میں ہے کہ بزرگان سلف سے ریاضات ومجاہدات اور عبادات کی جو شدت وکثرت منقول ہے، وہ دین محمدی کے ہرگز ہرگز خلاف نہیں ہے، بلکہ جو شخص ان مجاہدات کی قدرت رکھتا ہو، اور اس کا وقت فارغ ہو، اس کے حق میں یہ چیز کتاب وسنت میں بھی وارد ہے، البتہ اسے واجب کا درجہ نہیں دیا جا سکتا کیونکہ یہ نفل ہے، اور جس چیز کا آدمی کو مکلّف کیا گیا ہے، اس سے زائد ہے، ہاں اس پر ثواب عطا ہوگا۔

ٹھیک اسی طرح جیسے کتاب وسنت میں اس شخص کے حق میں میانہ روی اور عمل میں اعتدال کا حکم وارد ہے، جس کو اتنی عبادت وریاضت کی قدرت نہ ہو، اور اندیشہ ہو کہ وہ اکتا کر چھوڑ دے گا، اور معلوم ہے کہ دین میں سہولت بھی ہے اور دشواری بھی ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

اِتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقَاتِهٖ اللہ سے ڈرو جیسا کہ اس سے ڈرنے کا حق ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ امر دشوار ہے، اور دوسری جگہ فرمایا کہ: فَاتَّقُوا اللّٰهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ جتنا تم سے ہو سکے اللہ سے ڈرو۔ اس میں سہولت ہے، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے صوم وصال اور بھوک کی شدت وکثرت منقول ہے،

حتیٰ کہ آپ اپنے شکم مبارک پر پتھر باندھ لیتے تھے، اور آپ رات کو اتنی طویل نماز پڑھتے تھے کہ پائے مبارک ورم کرآتے تھے، اسی طرح آپ کی ازواج مطہرات امہات المؤمنین کے بارے میں منقول ہے کہ وہ بکثرت روزہ رکھتی تھیں اور نمازیں پڑھتی تھیں، اوپر گذر چکا ہے کہ حضرت زینب رضی اللہ عنہا نے اسی کے واسطے رسی باندھ رکھی تھی، جسے آپ نے ازراہ شفقت کھلوا دیا تھا (معصیت ہونے کی وجہ سے نہیں) اور اسی لئے جب آپ نے عبداللہ بن عمرؓ کو کثرت سے عبادت سے منع کیا، تو انہوں نے اس سے یہ نہیں سمجھا کہ کثرت عبادت خدانخواستہ کوئی گناہ ہے، اگر گناہ سمجھتے تو بار بار اجازت نہ مانگتے، اور یہی وجہ ہے کہ جب وہ بوڑھے ہوگئے، تو یہ فرمایا کہ

وددت انی قبلت رخصة رسول الله صلى الله عليه وسلم

(کاش رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دی ہوئی رخصت قبول کر لیتا) اس سے معلوم ہوا کہ جس بات کا حکم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دے رہے تھے، اسے ان صحابی رسول نے رخصت سمجھا تھا، اور جو کچھ وہ کر رہے تھے اسے عزیمت قرار دے رہے تھے، انہوں نے صرف اسی کو دین نہیں قرار دیا، جس کا حکم حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے ہو رہا تھا۔

مذکورہ بالا آیات واحادیث پر غور وتدبر کی نگاہ ڈالنے سے ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ یہ سب اللہ کی جانب سے بطور رحمت ہے، اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب سے بطور شفقت کے ہے، اور اس لئے کہ اہل ایمان کو سہولت رہے وہ تنگی میں نہ پڑیں، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ:-

لَاتُحَرِّمُوْا طَيِّبَاتِ مَآ اَحَلَّ اللّٰهُ لَكُمْ۔ جن پاکیزہ چیزوں کو اللہ نے حلال کیا ہے، انہیں حرام نہ کرو۔

یعنی ان کی رخصت کا انکار کر کے، ان کی حرمت کا اعتقاد نہ کرو، پس اگر تم نے کسی چیز کو حرام نہیں سمجھا، لیکن زہد وتقویٰ کی وجہ سے، اس سے اجتناب کیا، اور اسے استعمال نہیں کیا، تو اس میں کچھ گناہ نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:-

قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِيْنَةَ اللّٰهِ الَّتِيْٓ اَخْرَجَ لِعِبَادِهٖ وَالطَّيِّبَاتِ مِنَ الرِّزْقِ ط

تم کہدو! کہ اللہ نے جو زینت کا سامان اپنے بندوں کے لئے پیدا فرمایا ہے، اور جو پاکیزہ رزق ہے، اس کو کس نے حرام کیا۔

اور ایک حدیث کے آخر میں ہے:- فمن رغب عن سنتی فلیس منی جو میرے طریقے سے اعراض کرے، اس کا مجھ سے تعلق نہیں۔

اعراض کا مطلب یہ ہے کہ جو کچھ میں نے کیا ہے، اور جس کام میں میں نے رخصت دی ہے، اس کے جواز کا معتقد نہیں ہے، اور اس سے سخت اور مشکل کام کرتا ہے، یہ بات آپ نے ان لوگوں کے جواب میں ارشاد فرمائی ہے، جو یہ کہہ رہے تھے کہ این نحن من رسول اللّٰہ ہم کہاں اور اللہ کے رسول کہاں؟ اس کلام کا انداز بتا رہا ہے کہ وہ شریعت کی دی ہوئی سہولتوں کو ختم کرنا چاہتے تھے، اسی لئے آپ نے ان کے ساتھ کلام میں شدت اختیار کی۔

حاصل یہ ہے کہ گزشتہ بزرگوں نے اپنی ذات کی حد تک عزیمت کو اختیار

کیا تھا۔ ان کی ہمتیں بلند تھیں، ایسا نہ تھا کہ وہ شرعی رخصتوں اور سہولتوں کے معترف نہ تھے، وہ عوام الناس کے لئے انہیں رخصتوں اور سہولتوں کا فتویٰ دیتے تھے اور اسی کی ترغیب دیتے تھے، لیکن اپنے لئے عزیمت کو پسند کرتے تھے، خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بعض اوقات صحابہ کو رخصت کا حکم دیتے اور خود عزیمت پر عمل کرتے، چنانچہ صوم وصال کے واقعہ سے یہ بات بالکل واضح ہے۔ (الحدیقة)

خلاصۂ کلام

حضرت مولانا عبدالحیٔ صاحب فرنگی محلی علیہ الرحمہ فرماتے ہیں۔ اس مقام پر آخری بات، جس کو میں علماء کرام کے اتباع میں اختیار کرتا ہوں، یہ ہے کہ پوری رات نمازوں کا پڑھنا، ایک شب وروز میں ایک یا دو یا اس سے زیادہ مرتبہ قرآن کو ختم کرنا، ایک ہزار یا اس سے زائد رکعتوں کا ادا کرنا، اور اس نوع کے مجاہدات وریاضات نہ بدعت ہیں، اور نہ شریعت میں ممنوع! بلکہ وہ ایک امر مستحسن ہے البتہ یہ ہے کہ اس کے لئے چند شرطیں ہیں، جن کو ملحوظ رکھنا ضروری ہے۔

(۱) اس سے طبیعت میں اکتاہٹ نہ پیدا ہو کہ عبادت اور حضور قلب کی لذت وحلاوت ختم ہو جائے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ لیصل احدکم نشاطه (مسلم) آدمی اپنے دل کے نشاط اور طبیعت کی شگفتگی کے بقدر نماز وعبادت میں لگے۔

(۲) اس کی وجہ سے اپنے اوپر اتنی مشقت نہ لادے کہ اس کی برداشت

دشوار ہو، بس اپنی طاقت کے اندازہ سے عبادت کرے۔ فرمایا کہ:-

علیکم من الاعمال ماتطیقون اپنی طاقت کے بقدر اعمال اختیار کرو (بخاری)

(۳) یہ بھی خیال رہے کہ اس کی وجہ سے اس سے اہم کوئی حق نہ فوت ہو، مثلاً اگر رات بھر نماز پڑھنے کی وجہ سے صبح کی نماز قضا ہو جائے، تو یہ رات بھر کی عبادت درست نہیں، فرائض کا ادا کرنا نوافل سے اہم ہے، مؤطا امام مالک میں ہے کہ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے فجر کی نماز میں سلیمان بن ابی حشمہ کو نہیں دیکھا، انہوں نے ان کی ماں سے دریافت کیا کہ میں نے سلیمان کو فجر کی نماز میں نہیں دیکھا کیا بات ہے؟ ماں نے جواب دیا کہ سلیمان پوری رات عبادت میں رہے، صبح کے وقت ان کی آنکھ لگ گئی، حضرت عمر نے فرمایا کہ فجر کی نماز جماعت کے ساتھ ادا کرنی مجھے پوری رات کی عبادت سے زیادہ پسند ہے، تو اگر کوئی رات بھر جاگے، مسلسل روزہ رکھے، اور اس کی وجہ سے جماعت کی حاضری، نماز جنازہ کی شرکت درس وتدریس اور نشر علم سے محروم ہو جائے، تو یہ بہتر نہیں ہے۔

(۴) اس کی وجہ سے حقوق شرعیہ میں سے کوئی حق فوت نہ ہو، مثلاً اہل وعیال اور مہمانوں کے حقوق، چنانچہ یہ بات حضرت عبداللہ بن عمرو اور ابوالدرداء رضی اللہ عنہما کے واقعہ سے ظاہر ہے۔

(۵) اس کی وجہ سے شرعی رخصتوں کا ابطال نہ ہو، یعنی وہ شرعی رخصتوں کو

باطل اور اس کو اختیار کرنے والے کو مہمل نہ سمجھتا ہو، یہ بات ان صحابہ کی حدیث سے معلوم ہوتی ہے جنہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل کو کم سمجھا تھا۔

(٦) کثرت عبادت کی وجہ سے کسی غیر واجب کو واجب اور کسی حلال کو حرام کرنا لازم نہ آتا ہو، جیسا کہ حضرت عثمان بن مظعون رضی اللہ عنہ کی حدیث سے معلوم ہوتا ہے۔

(٧) عبادت کے تمام ارکان کو باقاعدہ بجالائے، ایسا نہ ہو کہ رکعات کی تعداد بڑھانے کے لئے مرغ جیسی ٹھونگیں مارنے لگے، یا قرآن کو بغیر ترتیل وتدبر کے پڑھے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ لایفقه القراٰن من قرأه فی اقل من ثلاث، جو تین دن سے کم میں قرآن ختم کرے اس نے قرآن کو نہیں سمجھا (ابو داؤد وترمذی) اس حدیث کے ظاہر کے پیش نظر بعض علماء نے تین دن سے کم میں قرآن ختم کرنے کو مکروہ قرار دیا ہے، اور دوسرے بعض اہل علم نے فرمایا ہے کہ اس حدیث میں ثواب کی نفی نہیں ہے، سمجھنے کی نفی ہے، اس لئے اس کو مکروہ نہیں کہا جاسکتا۔[1]

امام ترمذی فرماتے ہیں کہ بعض اہل علم کا ارشاد ہے کہ اس حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ تین دن سے کم میں قرآن نہیں پڑھنا چاہئے، اور بعض

---

[1] کیونکہ اگر نہ سمجھنے سے ثواب کی نفی ہوجائے، تو غیر عربی داں کی تلاوت لغو ہوجائے، حالانکہ ایسا نہیں ہے، ثواب کے حصول کے لئے فہم شرط نہیں ہے۔

دوسرے اہل علم نے اس کی اجازت دی ہے، چنانچہ حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ وہ وتر کی ایک رکعت میں پورا قرآن پڑھ لیتے تھے، اور حضرت سعید بن جبیر (مشہور تابعی) کے بارے میں منقول ہے کہ انہوں نے حرم شریف میں دو رکعت میں پورا قرآن پڑھا تھا۔ تاہم قرأت میں ترتیل اہل علم کے نزدیک ایک پسندیدہ چیز ہے۔

(۸) جو عبادت اختیار کرے، اس پر دوام کرے اور بغیر عذر کے نہ چھوڑے فرمایا کہ احب الاعمال الی اللّٰہ ادومھا وان قل پسندیدہ عمل اللہ کے نزدیک وہ ہے جس پر دوام ہو، اگرچہ قلیل ہو (مسلم) اور فرمایا کہ:-

یا عبداللّٰہ لاتکن مثل فلان کان یقوم من الیل فترک قیام اللیل

اے عبداللہ تم فلاں کی طرح نہ ہونا کہ وہ پہلے تہجد پڑھتا تھا، پھر چھوڑ دیا (بخاری و مسلم)

(۹) اس کے مجاہدہ کی وجہ سے دوسرے مسلمانوں کو اکتاہٹ اور گھبراہٹ نہ پیدا ہو، مثلاً یہ نہ کرے کہ جماعت کی نماز میں بہت طویل سورتیں پڑھنے لگے، یا پورا قرآن ختم کرنے لگے، اس سے مقتدیوں میں اکتاہٹ پیدا ہوگی۔ کیونکہ ان میں کمزور بیمار اور اہل حاجت ہر طرح کے لوگ ہوتے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے کہ:-

اذا صلی احدکم للناس فلیخفف، فان فیھم الضعیف

والسقيم والكبير واذا صلى لنفسه فليطول ماشاء (بخاری ومسلم)

جب کوئی لوگوں کو نماز پڑھائے تو ہلکی اور مختصر پڑھائے، کیونکہ ان میں کمزور، بیمار اور بڈھے بھی ہوتے ہیں، اور جب تنہا پڑھے تو جتنی چاہے لمبی کرے۔

نیز بخاری ومسلم میں حضرت ابومسعود انصاری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا، اور عرض کی فلاں شخص اتنی لمبی نماز پڑھاتا ہے کہ میں اس میں شریک ہونے کی قدرت نہیں رکھتا، آپ یہ سن کر اس قدر خفا ہوئے کہ نصیحت کرتے وقت اتنا ناراض میں نے کبھی آپ کو نہیں دیکھا تھا، آپ نے فرمایا کہ لوگو! تم میں کچھ ایسے ہیں کہ لوگوں کو بدکاتے ہیں۔ جو شخص نماز پڑھائے، وہ ہلکی پڑھائے، کیونکہ جماعت میں بوڑھے کمزور اور اہل حاجت سب طرح کے لوگ ہوتے ہیں۔

بخاری ومسلم میں جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضرت معاذ نے نماز عشاء کی امامت کی اور اس میں لمبی قرأت کی اس کی وجہ سے ایک آدمی نماز توڑ کر علیحدہ ہوگیا۔ حضرت معاذ کو اس کی خبر ملی تو انہوں نے کہا کہ وہ منافق ہے، اس آدمی نے جب یہ بات سنی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا، اور حضرت معاذ کی بات کی اطلاع دی، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے فرمایا کہ کیا تم لوگوں کو آزمائش میں ڈالنے والا بننا

چاہتے ہو، جب تم امامت کرو تو سورۂ وَالشَّمْسِ وَضُحٰهَا، سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْاَعْلٰى، اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ اور وَالَّيْلِ اِذَا يَغْشٰى پڑھا کرو۔ اس باب میں متعدد روایتیں ہیں۔

(۱۰) ایک شرط یہ بھی ہے کہ اپنی کثرت عبادت اور مجاہدہ وریاضت کی وجہ سے اپنے عمل کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرات صحابہ کے عمل سے افضل نہ سمجھنے لگے۔

جس شخص میں یہ شرطیں موجود ہوں، اسے کثرت عبادت اور ریاضت و مجاہدہ کا حق ہے، جن اصحاب کی ریاضات کا تذکرہ ہوا، وہ ان شرطوں کے جامع تھے، اس لئے ان کے حق میں یہ طریقۂ عمل جائز تھا، اور ان پر کسی نے نکیر بھی نہیں کی ہے، اور جس کے اندر یہ شرطیں نہ ہوں، اس کے لئے اعتدال و توسط ہی متعین ہے۔

یہ وہ معتدل راہ ہے جس کو ہر صاحب انصاف پسند کرے گا، اس میں نہ افراط ہے نہ تفریط ہے یہ تحقیق نہایت قابل قدر ہے۔ وللّٰہ الحمد اولاً وآخراً وصلی اللّٰہ علی سیدنا محمد وآلہ وصحبہ وسلم تسلیماً کثیراً۔

دسترخوان کی نعمتیں

دعوت فکر و عمل

وظائف و عملیات

فضائل صبر و شکر
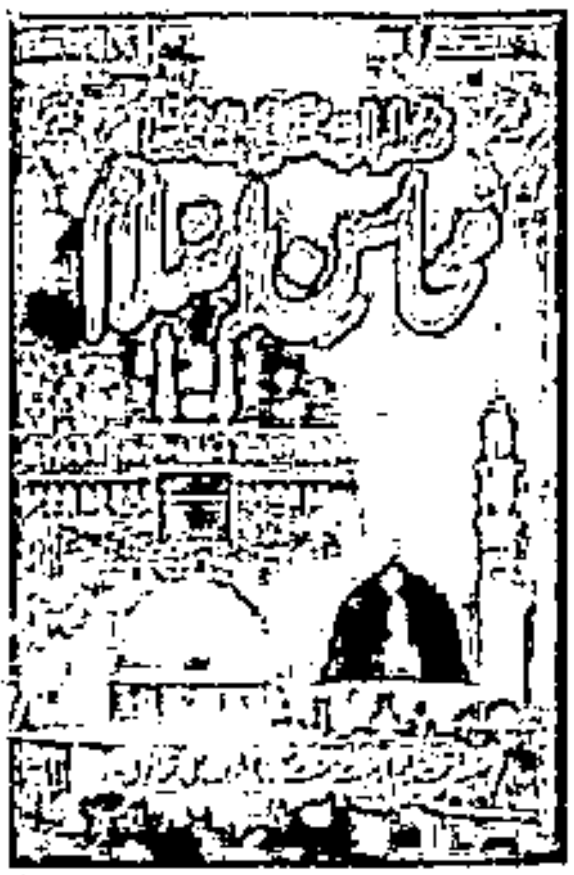
محاسن اسلام

فضائل صوم و صلوٰة

حقوق الزوجین

آداب المعاشرت

Rs.28/-

FARID BOOK DEPOT (P.) LTD.
Corp. Off.: 2158, M.P. Street, Pataudi House, Darya Ganj, N. Delhi - 2
Phones : 23289786, 23289159. Fax : 23279998 Res.: 23262486
E-mail : farid@ndf.vsnl.net.in Websites : faridexport.com, faridbook.com